تحریکِ جہاد جماعت اہلحدیث

اور

علمائے احناف

دیوبندی اہلِ قلم کے اِفتراءات والزامات
اور ان کی تاریخ سازی کی حقیقت

از

حافظ صلاح الدین یوسف

ایڈیٹر الاعتصام - لاہور

ناشر

ندوۃ المحدثین

اسلام آباد • گوجرانوالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقيق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

سلسلہ ندوۃ المحدّثین

۳۳
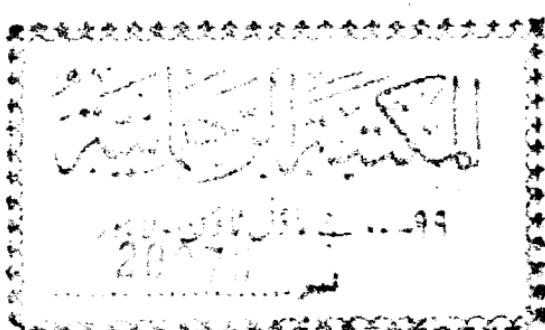
نام کتاب ———— تحریکِ جہاد، اہل حدیث اور احناف

نام مصنّف ———— حافظ صلاحُ الدّین یوسف

طبع اوّل ———— ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء

صفحات ———— ۱۲۸

تعداد ———— ایک ہزار

تقسیم بلا قیمت

باہتمام

ضیاء اللہ کھوکھر، ۱۳۔ اسلام آباد، گوجرانوالہ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

از مصنّف

دارالعلوم دیوبند اور اس کے فیض یافتگان کی علمی و دینی خدمات برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور ان دو دائرے میں اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر کے مطابق انہوں نے جو کام کیے ہیں، اختلاف کے باوجود ان سے مجالِ انکار نہیں۔

لیکن تعلیمی، تدریسی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ قومی و سیاسی خدمات سے مختلف ہے۔ ضروری نہیں کہ تعلیم و تدریس اور تبلیغ و تصنیف سے شغف اور وابستگی رکھنے والا سیاست کا بھی مردِ میدان ہو۔ اسی طرح اوّل الذکر شعبوں کی خدمات کی اہمیت بھی اس بات پر منحصر نہیں کہ ثانی الذکر خدمات کا ضمیمہ بھی اس کے ساتھ ضرور لگا ہو۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ وابستگانِ دیوبند نے اپنے اکابر کی سوانح و خدمات بیان کرنے میں اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ان کو جب تک سیاست کے میدان کا بھی رستم و سہراب ثابت نہ کر دیں، ان کی علمی عظمت اور تاریخی اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سوچ کی اس کجی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنے بزرگوں کی سیاسی خدمات کا بھی ایک ہیولیٰ تیار کریں، چاہے وہ خلافِ واقعہ ہی ہو۔

اس کے لیے انہوں نے تاریخ نگاری کی بجائے تاریخ سازی کا راستہ اختیار کیا، جس میں حسب ذیل امور کو انہوں نے نمایاں کرنے کی کوششیں کیں۔

۱۔ دیوبندیت کو فکرِ ولی اللّٰہی کا وارث قرار دیا، کیونکہ ولی اللّٰہی خاندان کی علمی خدمات اور مساعی تجدید و اصلاح اور آگے چل کر جہادی خدمات مسلّم ہیں۔ حالانکہ شاہ ولی اللہ اور

ان کے علمی خانوادے نے برصغیر پاک و ہند میں جس طرح حدیث کی اشاعت کی اور فقہی جمود کو توڑا، دیوبندیت کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا کردار و عمل ولی اللہی فکر و عمل سے یکسر مختلف رہا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی فکری مساعی کے تسلسل کو برصغیر پاک و ہند میں اگر کسی نے قائم رکھا ہے تو وہ اہلِ حدیث ہیں اور شاہ عبدالعزیز کے مسند نشین شاہ محمد اسحٰق کی ہجرت کے بعد اس ولی اللہی مسند کے وارث حضرت شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی ہوئے جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اس مسند پہ بیٹھ کر درسِ حدیث دیا اور ان کے فیض یافتگان نے پورے ہند میں قرآن و حدیث کا غلغلہ بلند کر دیا، جس سے فقہی جمود ٹوٹا، تقلید کی جکڑ بندیاں ڈھیلی ہوئیں اور قرآن و حدیث کی طرف رجوع عام ہوا۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مقدمہ "تراجم علمائے حدیث ہند" (مولفہ امام خاں نوشہروی مرحوم) میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

دیوبندی یہاں اس طرح تاریخ سازی کرتے ہیں کہ شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی کی جانشینی والے مسئلے کو بالکل گول کر جاتے ہیں اور حضرت میاں صاحب قدس اللہ روحہ کی مسند نشینی کا یا تو ذکر ہی نہیں کرتے یا پھر اُسے اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس کا رخ بآسانی دیوبندیت کی طرف موڑا جا سکے اور پھر دیوبندی اکابر کا تعلق اس سند سے وابستہ کر کے ان کو فکر ولی اللہی کا وارث قرار دیتے ہیں جو واقعات کے خلاف ہے۔ یہ موضوع چونکہ قدرے مختلف ہے اس لیے اس کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان کی تاریخ سازی کی بحث میں ضمناً یہ اجمالی ذکر یہاں زبانِ قلم پر آ گیا ہے۔

۲۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریکِ جہاد دارالعلوم دیوبند کے قیام سے بہت پہلے کی بات ہے[1] ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کا سانحہ پیش آیا جس میں مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ تحریکِ جہاد کا دورِ اول تھا ان کی شہادت کے بعد علمائے صادق پور نے پورے اخلاص اور عزم و استقامت کے ساتھ اس تحریکِ جہاد کی قیادت کی اور تقریباً پوری صدی اس راہ میں بے مثال قربانیاں

---

[1] دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۷ء (۱۲۸۳ھ) میں عمل میں آیا اور اس کے فضلاء کی کھیپ تیار ہونے میں بھی سالہا سال کا عرصہ صرف ہوا۔

پیش کیں جو نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی تحریکِ جہاد بلکہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ اس تحریکِ جہاد میں چونکہ بزرگانِ دیوبند کا کہیں نام نہیں آتا، اس لیے دیوبندی اہلِ قلم نے ۱۸۵۷ء کے ایک واقعۂ شاملی کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور اسے انگریزوں کے خلاف ایک زبردست جنگ باور کرایا ہے۔ اور پھر نصف صدی کے بعد ایک اور تحریک "تحریکِ ریشمی رومال" کا بڑا پروپیگنڈا کیا۔ جس سے ان کا مقصود بزرگانِ دیوبند کو جنگِ آزادی کا ہیرو بنانا ہے۔ حالانکہ "واقعۂ شاملی" اور "تحریکِ ریشمی رومال" کی وہ تفصیلات اور مقاصد جو دیوبندی اہلِ قلم ظاہر کر رہے ہیں، واقعات و حقائق ان کی تائید نہیں کرتے۔ جیسا کہ کتاب میں اس کی ضروری تفصیل آپ پڑھیں گے۔

۳۔ اسی سلسلے کی ایک کوشش دیوبندی اہلِ قلم کی یہ ہے کہ علمائے صادق پور کو حنفی باور کرایا جائے۔ اس طرح تحریکِ جہاد کا بہت سارا کریڈٹ از خود احناف کے حصے میں آجاتا ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ بھی یکسر خلافِ واقعہ ہے۔ اس کی تفصیل بھی آگے آرہی ہے۔

۴۔ ایک یہ مذموم سعی کی جارہی ہے کہ اہلِ حدیث کو انگریز کا وفادار ثابت کیا جائے۔ تاکہ اس طرح انگریز کے خلاف جدوجہد میں اکابرِ دیوبند کو نمایاں کیا جاسکے۔ حالانکہ یہ بات بھی واقعات کے خلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اہلِ حدیث علمائے دین سے مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے بوجوہ انگریز سے وفاداری کا اظہار کیا ہے، اسی طرح نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنے ریاستی منصب و عہدے کی مجبوریوں کی وجہ سے کچھ اس قسم کی باتیں کی ہیں،[1]

[1] اور نواب صاحب کے متعلق تو تحریکِ جہاد کے ایک باخبر اور غیر جانبدار مورخ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے یہ اعتراف کیا ہے کہ نواب صاحب دل سے اہلِ صادق پور کے ساتھ تھے لیکن ریجیوں کے ڈر سے اظہار اس کے برعکس کرتے تھے۔ مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر، ص ۸۳، طبع اول، پٹنہ، ۱۳۶۳ھ۔ علاوہ ازیں کتاب "اقبال اور بھوپال" میں نواب صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"علامہ جمال الدین افغانی، مصر کے مفتی محمد عبدہ اور سید احمد شہید کے رفقائے کار سے آپ کا قریبی ربط و تعلق تھا اور آپ پان اسلام ازم کی تحریک کے بڑے حامی تھے چنانچہ اسی بنا پر برطانوی حکومت نے آپ کا نوابی کا خطاب واپس لے لیا اور آپ کو کچھ عرصے تک نظر بند رکھا" (اقبال اور بھوپال، ص ۵۶، ۵۷، اقبال اکادمی لاہور، پاکستان)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ہے کہ علمائے اہل حدیث کی بہت بڑی اکثریت اور دیگر اعیان و نجبار تحریکِ جہاد میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اور اہلِ صادق پور، جو عامل بالحدیث تھے، تحریکِ جہاد کے روحِ رواں رہے۔ مولانا بٹالوی اور نواب صاحب کے طرزِ عمل کی بنیاد پر اہل حدیث کو، جنہوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جہاد کا علم تھامے رکھا، من حیث الجماعت انگریز کا وفادار باور کرانا انتہائی بد دیانتی کا ارتکاب ہے جس کا مظاہرہ دیوبندی اہلِ قلم کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔

۵۔ اہلِ حدیث کے برعکس کچھ احناف انفرادی طور پر اگرچہ تحریکِ جہاد میں شریک رہے ہیں لیکن احناف بالخصوص علمائے دیوبند کی من حیث الجماعت تحریکِ جہاد میں شمولیت تاریخی طور پر ثابت نہیں۔ لیکن دیوبندی اہلِ قلم اکابر دیوبند کو تحریکِ جہاد اور جنگِ آزادی کا ہیرو باور کرا رہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ جہاد میں تو سرے سے ان کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔ البتہ استخلاصِ وطن کی تحریکوں میں وہ شامل رہے ہیں۔ لیکن ان تحریکوں میں ان کی شمولیت مولانا محمود حسن کی مالٹا سے رہائی کے بعد ثابت ہے۔ اور یہ وہ وقت تھا جب یہ تحریکیں عام ہو گئی تھیں اور ان میں بلا تفریقِ مذہب و مسلک، ملک کا ہر طبقہ شریک تھا، جب کہ اہلِ حدیث اور اہلِ صادق پور اُس وقت انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے جب بقول شورش کاشمیری مرحوم ؎

ہم نے اُس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا
جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
سرفروشوں کے لیے دار و رسن قائم تھے!
خان زادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں
بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں
خونِ احرار میں ڈوبی ہوئی شمشیریں تھیں
از اُفق تا بہ اُفق خوف کا سناٹا تھا
رات کی قید میں خورشید کی تنویریں تھیں

۶۔ انگریز مبصرین اور غیر جانبدار مؤرخین نے جو صراحتیں کی ہیں کہ انگریز کے خلاف جدوجہد میں ہندوستان کا جو گروہ سب سے زیادہ سرگرم رہا ہے وہ "وہابی" تھا حتی کہ "وہابی" باغی کے مترادف سمجھا جاتا تھا، دیوبندی اہل قلم یہ باور کرارہے ہیں کہ یہاں وہابی سے مراد اہل حدیث نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو تحریکِ جہاد میں شریک اور انگریزی حکومت سے خلاف برسرِ پیکار رہے ہیں۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ بعض مؤرخین کے بیانات میں "وہابی" انہی مجاہدین کو کہا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں "وہابی" کہا کیوں گیا؟ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مجاہدین عقائد و اعمال کے لحاظ سے تھے ہی وہابی یعنی اہل حدیث۔ تحریک کی قیادت بھی زیادہ تر انہی کے ہاتھ میں رہی اور اس میں شریک عام افراد بھی اسی جماعتِ حقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ ایک قلیل تعداد حنفیوں کی بھی اس میں شریک رہی ہو لیکن چونکہ غالب اور معتدبہ تعداد اہلِ حدیث علماء و اعیان ہی کی تھی، اس لیے اس کے شرکاء کو وہابیت سے موسوم کر دیا گیا۔ اس لیے تحریکِ جہاد میں وہابی سے مراد اہلِ حدیث ہی ہیں نہ کہ حنفی یا حنفی اور اہلِ حدیث دونوں۔ اس کی تفصیل بھی آپ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

۷۔ ایک اور ظلم اہل دیوبند یہ کرتے ہیں کہ ان تحاریکِ آزادی کے ذکر میں، جن میں علمائے اہلِ حدیث اور اکابر دیوبند دونوں شریک رہے ہیں، صرف علمائے دیوبند کے کارناموں کی صراحت کرتے ہیں اور علمائے اہلِ حدیث کی خدمات اور کارناموں کو بالعموم بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں حالانکہ تاریخ نگاری میں یہ حزبی تعصب اور جنبہ داری کسی لحاظ سے مستحسن نہیں۔ اس کی تفصیلات بھی، چونکہ موضوعِ زیرِ بحث سے قدرے مختلف ہے، اس لیے اس وقت اس پر بحث مناسب نہیں۔

بہرحال یہ وہ خطوط ہیں جن پر اہل دیوبند نے اپنی تاریخ سازی کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خطوط کی روشنی میں تاریخ کا بے لاگ جائزہ لے کر صحیح صحیح حقائق و واقعات کو سامنے لایا جائے تاکہ دیوبندی ملمع سازی کا پردہ چاک ہو اور جن کرداروں پر پردہ ڈالنے کی کوششیں کی گئی ہیں یا انہیں زینتِ طاقِ نسیاں بنا دیا گیا ہے، انہیں اُجاگر کیا جائے اور تاریخ کا روئے زیبا اس طرح نکھارا اور اُجالا جائے کہ

ہر کردار اپنے استحقاق کے مطابق عظمت و اہمیت حاصل کرے، نہ کسی کو اس کے واقعی مقام سے گرایا جائے اور نہ کسی کو بیساکھیوں کے ذریعے سے اوپر چڑھایا جائے۔ غلو و تنقیص اور افراط و تفریط کا وہ سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے جس کی صراحت مذکورہ بالا پہلوؤں کے ضمن میں کی گئی ہے اور جس کا مظاہرہ دیوبند کے اکابر و اصاغر دونوں کی طرف سے مسلسل کیا جا رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب مذکورہ پہلوؤں کی روشنی میں تو نہیں لکھی گئی ہے کیونکہ اس کے لیے جتنی فرصت اور محنت درکار ہے، گوناگوں مصروفیات اس میں حائل ہیں۔ تاہم یہ ایک خاکہ گزشتہ سطور میں اس امید پر پیش کر دیا گیا ہے کہ شاید کوئی دیدہ ور اس خاکے میں رنگ بھر سکے اور تاریخ کے اس خلا کو پر کر سکے۔ راقم کی یہ کتاب تو دراصل ایک مضمون تھا جو آج سے ۱۲، ۱۳ سال قبل ایک دیوبندی پروفیسر کے جواب میں (جو اب ایک حادثے میں فوت ہو چکے ہیں رحمہ اللہ و غفرلہ) لکھا گیا تھا، جس میں مرحوم نے تاریخ سازی سے کام لیتے ہوئے علمائے اہلِ حدیث اور اہلِ صادق پور کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ابھی چند قسطیں ہی "الاعتصام" میں شائع ہوئی تھیں کہ راقم کے فاضل دوست جناب مولانا عبدالخالق قدوسی صاحب (مالک مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور) نے بھی ایک تنقیدی مضمون پروفیسر موصوف کے جواب میں لکھنا شروع کر دیا، چنانچہ راقم نے اپنا یہ سلسلہ بند کر دیا اور یوں یہ مضمون ہی تشنۂ تکمیل رہا۔

اس وقت سے ہی مضمون اس طرح ناقص صورت میں (چند مطبوعہ قسطوں سمیت) پڑا رہا۔ خیال یہی تھا کہ یہ ناخوشگوار بحث شاید اب دوبارہ منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے، اسی لیے راقم نے اپنے اس مضمون کو بالکل فراموش کر دیا تھا، لیکن بدقسمتی سے پروفیسر مذکور جو شوشے چھوڑ گئے تھے، دیوبندی اہلِ قلم اسے لے اڑے اور وہ مسلسل اس نہج پر دھڑا دھڑ لکھے جا رہے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں کئی دیوبندی دوستوں کی طرف سے مذکورہ خطوط پر مبنی ایسا اشتعال انگیز مواد سامنے آیا ہے کہ صبر و ضبط کے بند ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ کئی دوستوں نے بھی اس پر توجہ دلائی کہ دیوبندی اہلِ قلم کی طرف سے جو جارحیت کی جا رہی

ہے اور جماعت اہلِ حدیث کو انگریز کا وفادار باور کرایا جارہا ہے، اس کی حقیقت واضح کی جائے اور حقِ دفاع ادا کیا جائے۔

راقم، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے، عدمِ فرصت کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں کہ اس پر مفصل لکھ سکے، تاہم مَالَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ کے مصداق ہوچا کہ چلو فی الحال تفصیلاً نہ سہی اجمالاً ہی مذکورہ دعوے کی حقیقت واضح کر دی جائے۔ ہوسکتا ہے کسی وقت اس اجمال سے تفصیل کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

چنانچہ مختلف وقتوں میں راقم نے اپنے مذکورہ مضمون کو قدرے مکمل کیا، بحث کے ابھی بہت سے گوشے اگرچہ تشنہ ہیں، پھر بھی امید ہے کہ یہ ادھورا اور ناقص مضمون بھی انشاءاللہ دیوبندی دعووں کی قلعی کھولنے میں شاہ کلید ثابت ہوگا، اس سے یقیناً تحقیق کی نئی راہیں کھلیں گی، بہت سے حقائق واشگاف ہوں گے، پروپیگنڈے کی جمی ہوئی دبیز تہیں صاف ہوں گی اور اہلِ حدیث کی مظلومیت کا کچھ مداوا ہو سکے گا۔ راقم نے فی الحال اس غیر مکمل مضمون کے ذریعے سے اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا پر عمل کرتے ہوئے مظلومین (اہلِ حدیث) کا دفاع کیا ہے اور ظالم کو اُس کے ظلم سے آگاہ کر کے اسے آئندہ کے لیے ظلم و جارحیت سے روکنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کرے کہ فریقِ ظالم اپنے ظلم سے باز آجائے تاکہ آئندہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

وما ذلك على الله بعزيز۔

صلاح الدین یوسف

ایڈیٹر "الاعتصام" لاہور

محرم الحرام ۱۴۰۶ھ • ستمبر ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر ایوب قادری کے جواب میں

کہا جاتا ہے، کہ یہ دورِ علم و تحقیق کا دور ہے۔ ریسرچ ورک کی آج کل بڑی اہمیت ہے۔ اس کے لیے بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ جہاں اربابِ فکر و نظر بحرِ علم کی شناوری کر کے، علم و تحقیق کے گوہر آبدار برآمد فرماتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ چیز حد درجہ افسوسناک ہے۔ کہ اس قسم کا بیشتر تحقیقاتی کام اُس کھلے دل و دماغ، غیر جانبداری اور ذہنی دگرہ ہی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر نہیں کیا جاتا۔ جو اس کام کے لیے انتہائی ضروری ہے لہٰا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی صاحب کے دماغ میں کسی چیز کے متعلق کوئی موہوم تصور یا غلط مفروضہ کسی خاص ماحول، ذہن یا حزبی تعصب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو بنیاد بنا کر اوراقِ تاریخ کی ورق گردانی کرتا ہے۔ تو قدرتی طور پر اس کا ذہن وہ چیزیں تو اخذ کرتا چلا جاتا ہے جو اس کے ذہنی مفروضے کو کسی نہ کسی انداز کی بنیاد فراہم کر سکے۔ لیکن وہ تمام حقائق اس کی نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ جو اس کے مفروضے کو غلط ٹھہراتے ہوں۔ کیونکہ اس کے ذہن میں ایک خاص تصور کارفرما ہوتا ہے۔ جو اس کے عملِ تحقیق کے رُخ کو ایک خاص ڈگر پر ڈال دیتا ہے۔ جس کے بعد دریافتِ حقائق اس کا مقصد نہیں رہتا بلکہ ذہنی واقعات کو حقائق کا رنگ دینا اس کے پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی ایک "تاریخی شاہکار" کراچی کے ایک پروفیسر جناب محمد ایوب صاحب قادری کا وہ مضمون ہے، جو پہلے "البلاغ" کراچی میں اور پھر ہفت روزہ "پٹھان" لاہور میں شائع ہوا۔ جس میں برصغیر کی تاریخِ اہلِ حدیث کو افسوسناک حد تک بالکل خلاف واقعہ غلط رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ سرسید کے دور سے جماعت اہلحدیث

نے اپنا طرزِ عمل بدل لیا اور انگریز کی حمایت و وفاداری اس کا شعار قرار پایا۔ اسی ضمن میں ایک دوسرا الزام یہ عاید کیا گیا۔ کہ انگریزی تعلیم کے پھیلانے میں اس جماعت نے نمایاں حصہ لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں الزام واقعات وحقائق کے یکسر خلاف اور اس ذہنی وگروہی تعصب کا آئینہ دار ہیں۔ جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں الزام اس وقت تک ثابت نہیں کیے جا سکتے، جب تک کوئی انسان علمی دیانت اور واقعات نگاری کے مسلمہ اصولوں کو پس پشت نہ ڈال دے۔ چنانچہ اس مضمون میں یہی اندازِ تحقیق اپنایا گیا ہے۔

اوّلاً ہم صاحبِ مضمون کے ذہنی تعصب کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اس "تحقیق" میں اسی کی کارفرمائی ہے۔ مضمون نگار دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق اور علماء دیوبند سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جماعت اہلِ حدیث اور علماء اہلحدیث سے لاگ رکھنے پر طبعاً مجبور ہیں۔ غالباً یہ بھی دیوبندی مسلک کا کوئی جزو ہے۔

دوسری نمایاں دلیل اس امر پر ان کی یہ "تحقیق" ہے، کہ سرسیدؔ صرف اہلحدیث ہی نہیں کٹر اہلِ حدیث تھے۔ یہ رائے صرف وہی شخص رکھ سکتا ہے، جس کے ذہن میں اہلحدیث کے خلاف جذبہ مخاصمت کام کر رہا ہو۔ ورنہ اس حقیقت سے کون ناآشنا ہے، کہ اہلِ حدیث اور سرسیدؔ میں کتنا بُعد المشرقین ہے۔ ان دونوں کو ایک باور کرانا آگ اور پانی کو جمع کرانے کے مترادف ہے۔ اہلِ حدیث قرآن وحدیث کی خالص سلفی تعبیر کے قائل ہیں۔ اور اس سے ایک بال برابر ہٹنا انہیں گوارا نہیں۔ یہانتک کہ علماءِ دیوبند آئے دن علماءِ اہلحدیث پہ ظاہر بینی کی پھبتی کستے رہتے ہیں جسے اہلحدیث علماء اس لیے گوارا کر لیتے ہیں کہ اس طرح اگرچہ ہم ہدفِ طعن بن جائیں گے۔ ... لیکن قرآن وحدیث بہرحال بازیچہ اطفال بننے سے بچ جائیں گے۔ اس کے بالمقابل سرسیدؔ نے قرآن وحدیث کی جو تاویلاتِ رکیکہ پیش کی ہیں وہ ظاہر ہے کہ کسی "ظاہر بین" کا کام نہیں ہو سکتا۔ وہ تو علماءِ دیوبند کی طرح کسی "غواص" ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ جو ظاہر پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کا مغز نکالتے ہیں، پھر بھی دعویٰ یہ ہے، کہ سرسیدؔ "اہلحدیث" تھے۔ اگر محض کسی شخص کا زبان سے کہہ دینا کافی ہے، کہ میں اہلحدیث، یا حنفی ہوں۔ اور

اس کے بعد اس کے عقائد، اس کا طرزِ عمل اور اس کا پوری زندگی میں یہ دیکھنا ضروری نہیں
کہ اس کے زبانی دعوے اور عمل میں کتنا توافق ہے ؟ تو ہم محترم مضمون نگار سے عرض کریں
گے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی اپنے متعلق "حنفی" ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کا ایک اور
ہم نام وہمزاد غلام احمد پرویز بھی اپنی حنفیت کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے۔ جس کی
تصدیق کی جاسکتی ہے۔ کیا جناب کے بیان کردہ اصول کی رُو سے مرزائیوں اور پرویزیوں
کو بھی احناف ہی کا گروہ سمجھا جائے؟ بہرحال ہم یہ عرض کر رہے تھے، کہ سرسید کو "اہلحدیث"
باور کرانا، یہ بھی صاحب مضمون کی ذہنی تعصّب کی دلیل ہے۔

علاوہ ازیں پورے مضمون کا ہر جُز اس بات کا شاہد ہے کہ مضمون نگار نے دیانتداری
اور غیر جانبداری کی بجائے ایک خاص تعصب، اور جانبداری سے کام لیا ہے۔

ثانیاً آج کل ملک میں جو خطرناک حالات، سیاسی آویزش اور نظریاتی انتشار
برپا ہے۔ جس کی وجہ سے تمام حق پسند جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک واتحادِ
عمل میں کوشاں ہیں، ان حالات میں اہل حق کی ایک جماعت کے خلاف ایسا دل آزار
مضمون "اہلِ حق" ہی کے ایک گروہ کی طرف سے شائع ہونا ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ تھوڑی
دیر کے لیے فرض کر لیجیئے، کہ صاحبِ مضمون کا یہ الزام درست ہے کہ جماعت اہلحدیث
انگریز کی وفادار رہی ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ دوسری اسلامی و مذہبی جماعتوں کے
شانہ بشانہ اہلِ باطل سے برسرِ پیکار ہے۔ اس قسم کی "تحقیق" کا منشا کیا ہے؟ جماعت
اہلِ حدیث کا وہ کون سا جُرم ہے، جسے ہمارے یہ کرم فرما ان نازک حالات میں بھی معاف
کرنے کو تیار نہیں، کہیں ہمارا جُرم بھی تو وہ نہیں جس کی طرف ایک عربی شاعر نے اشارہ
کیا ہے۔ ع

وَجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ

(تیرا وجود ہی ایسا جُرم ہے۔ جس سے بڑھ کر کوئی جُرم نہیں)

ثالثاً اس مضمون کی "چٹان" میں اشاعت مزید حیرت و استعجاب
کا باعث ہے، محترم جناب آغا شورش کاشمیری صاحب خود بھی انگریزی استبداد سے

نبرد آزما، اس راہ کی آبلہ پائیوں کے زخم خوردہ قافلۂ حریت کے باقیات میں سے ہیں اور ان کے سامنے جماعت اہل حدیث کی جہادی سرگرمیوں کا پورا نقشہ ہے۔ ان کی تفصیلات سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں، اور جماعت کی خدمات کے معترف ہیں۔ آج سے تین سال قبل، لاہور میں اہلحدیث کانفرنس کے عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آغا صاحب نے جماعت اہل حدیث سے متعلق فرمایا تھا۔ کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب سے زیادہ خون اسی جماعت کے افراد کا بہا ہے۔ اس تقریر کے کچھ اقتباسات "چٹان" میں بھی شائع ہوئے تھے۔ آغا صاحب نے فرمایا تھا۔

"۱۸۵۷ء میں جب دہلی مرحوم ہو گئی، مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی، اور ان کے لیے ہندوستان کا طول و عرض تنگ ہو گیا۔ تو جس جماعت کو سب سے زیادہ انگریزی استعمار کے چولہے کا ایندھن بننا پڑا، پھر علماء پر جو مقدمات قائم کیے گئے، اور یہ سلسلۂ دار و گیر انیسویں صدی کی آخری آٹھ اور نو دہائیوں تک چلتا رہا، تو جن لوگوں نے ہندوستان کے مقتل میں جان دی۔ ان میں پونے دو لاکھ افراد تھے۔ جن کا اپنا نام تو اس قتل عام کی زود فراموشی کے باعث محفوظ نہیں رہ سکا، لیکن ان کی جماعت کا نام رہ گیا۔ اب جو ریکارڈ سامنے آرہا ہے۔ اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کے خون پر جو چھاپ لگائی گئی تھی، وہ ان کے وہابی ہونے کی تھی... یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، کہ اس سب سے بڑی مصلح جماعت، اور اس کے غیرت مند رہنماؤں کو برطانوی استیلاء اور بدعتی فضا کے پروردوں نے دشنام و اتہام کا ہدف بنا کر اسلام کی طاقت کو کمزور کیا، اور اسلام کی حقیقت کو مجروح۔ ورنہ ایک خاص مرحلے سے ایک خاص دور تک ہندوستان میں اسلام کی تاریخ وہابی جماعت ہی کی مرہونِ سپاس ہے۔ میں اہلحدیث کا اس لحاظ سے معترف ہوں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کے گوہر یک دانہ بھی مسلمانوں میں موجود

رہے ہیں۔ جنہوں نے دین کو صحیح کیا، لیکن خود رسوا ہو گئے، جنہوں نے اسلام کو بالا کیا، لیکن خود غضب کا شکار ہو گئے۔ جنہوں نے غیر ملکی استعمار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن اپنوں کے ہاتھوں اور پرایوں کے خنجروں سے گھائل ہوتے رہے۔"

(ہفت روزہ "چٹان" ۱۴ نومبر ۱۹۶۷ء)

جماعت اہلحدیث سے متعلق آغا صاحب کے یہ خیالات اور اعترافِ خدمات کی بنا پر اس مضمون کی اشاعت پر ہمیں تعجب ہوا جس میں اس کے برعکس دوسرے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ممکن ہے آغا صاحب نے بحث و نقد کے لیے ایسا کیا ہو تاکہ تاریخ کے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارا جا سکے۔ اسی لیے آغا صاحب نے اپنے نوٹ میں اس موضوع پر تحقیق کی دعوتِ عام دی ہے۔ جسے ہم قبول کرتے ہوئے چند گذارشات پیش کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کا جو نقطہ نظر تھا۔ پروفیسر ایوب قادری صاحب کے الفاظ میں سن لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"سرسید احمد خاں نے غور و فکر کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ انگریزوں کی پائیدار اور مستقل حکومت قائم ہو جانے کے بعد اب حالات ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے مل کر رہنا چاہیے۔ اور امن و امان کی زندگی گذارنی چاہئیے۔ راعی اور رعایا کی غلط فہمی دور ہونی چاہیے اور کچھ دنوں کے لیے مسلمانوں کو سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیئے۔ اور گورنمنٹ کے دل میں اپنی وفاداری کا پورا نقش بٹھا دینا چاہیئے تاکہ مسلمانوں سے انگریزوں کی بدظنی دور ہو جائے اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور مغربی فنون کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔"

یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے حالات کی غایت درجہ نزاکت، سرسید کے نزدیک اس امر کی متقاضی تھی کہ مسلمانوں کا رُخ انگریز دشمنی کی بجائے حکومت انگریزی سے

تعاون کی طرف موڑ دیا جائے۔

اب اس نقطہ نظر سے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سارے مسلمانوں سے واقعتاً انگریزی حکومت کے خلاف جو جماعت باغیانہ جذبات رکھتی تھی اور اس کے لیے عملاً ہر ممکن قربانیاں پیش کر رہی تھی۔ وہ جماعت اہل حدیث تھی (جس کا اعتراف قادری صاحب کو بھی ہے) اسی کو جماعت مجاہدین کہا جاتا تھا۔ اور وہی "وہابی" کہلاتی تھی۔ اسی لیے انگریزی مظالم اور استبداد کا شکار بھی تقریباً یہی جماعت ہو رہی تھی۔ جیسا کہ ۱۸۶۴ء تا ۱۸۷۱ء کے وہابی مقدمات کی روئدادیں اسی پر شاہد ہیں[1] ادھر ولیم ہنٹر نے گرم گرم رپورٹ وہابیوں کے خلاف دے دی، جس نے انگریزی حکومت سے جذباتِ بغاوت کو صرف وہابیوں۔ "اہلحدیث" کے ساتھ مرکوز کر دیا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور انگریزی مشنری اس جماعت کو ملیامیٹ کرنے پر تل گئی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں حسب تصریح پروفیسر صاحب موصوف سرسید وہابیوں کی مدافعت کے لیے میدان میں نکل آئے۔ اور اعلان کیا کہ "میں وہابی ہوں اور اپنے عقائد کی روح سے انگریزی حکومت کا وفادار ہوں۔ اور کوئی وہابی انگریزی گورنمنٹ سے بغاوت نہیں کر سکتا"

سرسید مرحوم کا یہ اعلان دراصل ان کے اسی جذبۂ درد کا ایک حصہ تھا۔ جس جذبہ کے تحت انہوں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" کتاب لکھی تھی۔ اور مسلمان قوم کو کسی طریقہ سے بچانے کی فکر میں تھے۔ اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ سرسید "اہل حدیث" تھے جس پر اپنے مضمون کی ساری عمارت محترم قادری صاحب نے کھڑی کی ہے۔ اگر احناف کرام جن کو ہنٹر نے "وہابی" کے مقابلہ میں "سُنّی" سے تعبیر کیا ہے باغیانہ سرگرمیوں کی بھٹی میں جل رہے ہوتے تو یقیناً سرسید خود کو "حنفی" قرار دے کر ان کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے ویسے ہی الفاظ استعمال کرتے لیکن سُنّی "بوجوہ شبہات کی بنا پر پکڑ دھکڑ کے خوف سے یا انگریز کی طرف فرار ہے تھے یا کنج عافیت میں جبہ و دستار سنبھالنے کی فکر میں تھے اور یا پھر وہابیوں کو مساجد سے نکال باہر کرنے کے فتاویٰ صادر کرنے

---

[1] ان مقدمات کی مختصر تفصیل مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں درج کی ہے تاہم یہ تفصیلات ابھی کسی دیدہ ور مورخ کی منتظر ہیں

کا شغل فرما رہے تھے۔ والقصۃ بطولہا، ع

ہمیں یاد ہے سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ دو سطریں بلا ساختہ قلم سے نکل گئیں، ورنہ ہمارے دل میں سب بزرگوں کا بہت احترام ہے۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ (البقرۃ)

غلطی ہائے مضامین

اسی مضمون میں محترم قادری صاحب مزید لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے مسلمان غالب اکثریت میں فقہ حنفی کے ماننے والے ہیں۔ خواص اور علماء میں بعض حضرات اہلِ حدیث بھی گذرے ہیں۔ مولوی اسماعیل شہید نے اس فکر کو خاص طور سے بڑھایا، اور اپنے متبعین کی ایک جماعت پیدا کرلی۔ حالانکہ جماعتِ مجاہدین میں اہلحدیث اور حنفی دونوں گروہ کے لوگ موجود تھے۔ سید احمد شہید کا رحجان تو واضح طور سے حنفیت کی طرف تھا۔ اور مولانا ولایت علی صادق پوری کا بھی یہی مسلک تھا۔ انہوں نے ایک موقع پر فرمایا "میں حنفی المذہب ہوں اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ کہ اگر کوئی حنفی کسی حدیثِ صریح غیر منسوخ کو دیکھ کر کسی فقہی مسئلے کے خلاف عمل کرے تو وہ مذہب حنفی سے خارج نہیں ہوتا"

یہ پورا اقتباس غلطیہائے مضامین کا آئینہ دار ہے۔

اولاً اس میں یہ تأثر دیا گیا ہے۔ کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے جماعت مجاہدین میں اہلِ حدیث نقطۂ نظر کی خاص طور سے اشاعت کی۔ بالفاظ دیگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت شہیدؒ نے جماعت مجاہدین میں، جس میں حنفی اور اہلِ حدیث دونوں گروہ تھے۔ فقہی وگروہی تعصب کی داغ بیل ڈالی۔ یہ تأثر بالکل خلافِ واقعہ ہے حضرت شہیدؒ اہلِ حدیث ضرور تھے۔ لیکن ان فروعی مسائل میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اس طرح نہیں کھپایا، جس طرح صاحب مضمون نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی توجہ کا زیادہ مرکز شرک و بدعت آمیز توہمات، غیر اسلامی وجاہلانہ رسوم

ورواج کی بیخ کنی اور عقائد کی اصلاح تھا۔ اور دوسرا اہم مقصد اس مشن کو زندہ رکھنا تھا۔ جو خود انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی سرکردگی میں شروع کیا تھا۔ اہلِ حدیث کے وہ مسائل جن کو ہمارے "برادرانِ یوسف" کی نوازشوں نے "امتیازی مسائل" بنا دیا۔ ان کو مولانا شہید نے زیادہ مدارِ بحث نہیں بنایا تھا نہ مجاہدین کی جماعت میں ان کی مخصوص طور پر اشاعت کی گئی۔

دوسرا تاثر اس سے یہ ملتا ہے کہ جماعت مجاہدین کی قیادت بھی عموماً احناف کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ اسی لیے اس اقتباس میں سید احمد شہید کے ساتھ مولانا ولایت علی جیسے مشہور عامل بالحدیث شخص کو بھی مسلکِ حنفیت سے منسلک قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جماعت مجاہدین کی قیادت زیادہ تر اہلِ حدیث حضرات کے ہاتھ میں رہی ہے۔ خود اس مضمون سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ "اہلِ حدیث" ہی اس جماعت کے رأس المال اور روح رواں تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔ علاوہ ازیں جو ممتاز حضراتِ احناف اس جماعت میں شامل رہے۔ وہ سب ولی اللہی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ جو اگرچہ فقہ حنفی پر عمل پیرا تھے لیکن اس تقلید جامد سے ان کا دامن بہرحال پاک تھا۔ جس پر خاص طور پر علمائے دیوبند کاربند رہے۔ ان کی حنفیت میں عمل بالحدیث کا جذبہ روزافزوں رہا۔ اور اس میں شامل اہلحدیث حضرات کو ایسی حنفیت سے کوئی کد نہ تھی۔ نتیجۃً یہ پاکباز گروہ باہم شیر و شکر ہو کر اصلاحِ عقاید میں سرگرم اور اہلِ باطل سے برسرپیکار رہا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مثال کے طور پر حضرت سید احمد شہید حنفی تھے، لیکن صراطِ مستقیم کا یہ پیرا اہلِ دانش کے لیے سرمۂ بصیرت ہے۔ خیال رہے کہ صراطِ مستقیم سید احمد کے ملفوظات کا مجموعہ ہے فرماتے ہیں۔

"دراعمال اتباعِ مذاہب اربعہ کہ رائج در تمام اہلِ اسلام است بہتر و خوب است لیکن علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را منحصر در علم یک شخص از مجتہدین نداند

بلکہ علمِ نبوی منتشر در آفاق گردیدہ بموجب مقتضیاتِ وقت بہر کس رسیدہ وبعد ازاں کہ کتبِ مصنف شدہ جمیعت آں علوم ظاہر گشتہ۔ پس درہر مسئلہ کہ حدیثِ صحیح صریح غیر منسوخ یابد، اتباع ہیچ مجتہد دراں نہ کند واہلِ حدیث را مقتدائے خود شناسد و بہ دل صحبتِ ایشاں دارد و تعظیمِ ایشاں لازم شمرد کہ حاملانِ علم پیغمبر اند و بہ نوعِ مصاحبت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حاصل کردہ مقبول جنابِ رسالت مآب گشتہ اند"

(صراطِ مستقیم۔ ص۸)

یعنی "مذاہب اربعہ کی عموماً رائج اتباع ٹھیک ہے۔ لیکن علمِ نبوی کو ایک مجتہد میں منحصر نہ سمجھا جاوے۔ اس لیے کہ ہر مجتہد کو وقت کی ضرورت کے مطابق اس سے حصہ مل گیا۔ تاہم جب کتبِ حدیث معرضِ وجود میں آگئیں تو علمِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان میں یک جا ہو گیا۔ بنابریں جس مسئلے میں بھی حدیثِ صحیح وصریح غیر منسوخ مل جائے تو اس کے خلاف کسی بھی مجتہد کی اتباع نہ کی جائے۔ اس بارے میں اہلحدیث کو مقتدا ماننا چاہیئے۔ اور ان سے محبت اور ان کی تعظیم ضروری ہے۔ علمِ نبوی کے وہی حامل ہیں۔ جن کو ایک قسم کی صحبتِ نبوی کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں مقبولیت کا شرف حاصل ہے۔"

اصولاً مسلکِ اہلِ حدیث بھی یہی ہے۔ اور اس مسلک کے حامل کو "حنفی" نہیں سمجھا جا سکتا۔

ثالثاً۔ یہ دعویٰ بھی پُر لطف ہے کہ "مولانا ولائت علی صاحب صادق پوری اور ان کے اصحاب وتلامذہ بھی حنفی تھے" ان حضرات کی حنفیت کے دعوے کا پس منظر یہ ہے کہ سید اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہید کی شہادت کے بعد تحریک جہاد کی پوری قیادت مولانا ولایت علیؒ، ان کے بھائی مولانا عنایت علیؒ اور درجہ بدرجہ ان کے تلامذہ واحباب اور دیگر اہلِ خاندان نے کی ہے۔ ان کے قائدانہ کارناموں، جہادی سرگرمیوں اور اس راہ کی پُر صعوبت مشقتوں کی تفصیل مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی کتاب ہندوستان کی

پہلی اسلامی تحریک" میں بڑے تذکرہ و تألم کے انداز میں بیان کی ہے، نیز "تذکرہ صادقہ" بھی اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ ہے۔ اب اگر ان کی حنفیت ثابت کر دی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شہیدین کے سانحۂ شہادت کے بعد تحریکِ جہاد کی مرکزی قیادت احناف کے ہاتھ میں آ گئی اور یہی محترم مضمون نگار کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔

حالانکہ یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔ نہ مولانا عنایت علیؒ، ان کے تلامذہ و احباب اور اہلِ خاندان فقہ حنفی کے مقلد تھے اور نہ علمائے دیوبند ہی نے تحریک جہاد کی کسی مرحلے پر قیادت کی ہے۔ اس موقع پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مولانا ولایت علیؒ کے مسلک پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈال دی جائے۔ تاکہ اس ابہام یا مغالطے سے فائدہ اٹھا کر تحریک جہاد کا کریڈٹ غیر متعلق حضرات کو دینے اور اصل حصہ لینے والوں کو اس سے محروم کرنے کا چور دروازہ ہی بند ہو جائے۔

مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کا مسلک

مولانا ولایت علی کے لکھنؤ میں عربی تعلیم کے دوران سید احمد شہیدؒ کا لکھنؤ میں ورود ہوا، مولانا ولایت علیؒ نے وہیں ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لی، سید صاحبؒ ان کو اپنے ساتھ بریلی لے گئے اور وہاں سید اسمٰعیل شہیدؒ کی تربیت میں دے دیا۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ لکھتے ہیں۔

"آپ عین قیام بریلی کے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی جماعت میں بھرتی تھے اور انہیں سے حدیث پڑھتے تھے۔۔۔۔۔ مولانا شہیدؒ نے اپنی جماعت میں آپ کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔" [1]

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی تعلیم اور صحبت و تربیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقلیدی جمود ٹوٹا اور براہِ راست سنتوں پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ مولانا عبدالرحیم آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"آپ کی ترغیب تحصیلِ قرآن و احادیث سے اور وعظ و نصائح سے ملک ہندوستان میں عمل بالحدیث کا چرچا ہوا اور تقلید و تعصب کی بناکمزور و مضمحل ہونے لگی، کیونکہ قرآن و حدیث کی محبت اور ان کی ترویج نے حق کو روشن کر دیا۔ جاء الحق وزھق الباطل۔" [2]

مولانا مسعود عالم ندویؒ لکھتے ہیں۔

"رد بدعت پر متعدد کتابیں شائع کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خاندان

---

[1] تذکرۂ صادقہ، ص ۱۱۱

[2] حوالۂ مذکور، ص ۱۱۷

یں عمل بالسنۃ کی تجدید کی، صوبہ بہار اور بنگال میں نکاحِ بیوگان کا آغاز آپ ہی کے خاندان سے ہوا، اس سنت کو خوب جاری کیا، ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح کرا دیئے۔" [1]

خیال رہے کہ عمل بالحدیث اور عمل بالسنۃ جیسے الفاظ کا کسی شخص کے لیے استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب وہ تقلید کی جکڑ بندیوں سے نکل کر براہ راست قرآن و حدیث سے استفادہ اور ان سے استنباطِ مسائل کرتا ہے، چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی نے ان کئی سنتوں کا ذکر کیا ہے جن کا ان سے احیاء ہوا، اس میں ایک سنت انہوں نے یہ ذکر کی ہے۔

"ایک شخص عبدالغنی نگرنہسوی (جو زمرہ مساکین سے تھے) کا عقد ایک بیوہ عورت سے "تعلیم قرآن" مہر قرار دے کر کر دیا۔" [2]

ظاہر ہے کہ "تعلیم قرآن" کو بطور مہر قرار دینا فقہ حنفی کے بالکل خلاف ہے، البتہ اہلِ حدیث اس کے اس بنا پر قائل ہیں کہ حدیث سے یہ عمل ثابت ہے۔ اس مثال سے ان کے عمل بالحدیث کی توضیح ہو جاتی ہے۔ اس کی مزید مثالیں ہم آگے ذکر کریں گے۔

مولانا مسعود عالم ندوی ان کی تبلیغی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دینیات کی تعلیم کے لیے گھر پر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن و حدیث کا درس دیتے، آپ کے بڑے بیٹے مولوی عبداللہ قاری ہوتے۔ دوسرے علماء تفسیر کی کتابیں ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ عام مریدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی۔ قرآن مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے۔ شاہ محمد اسحاق سے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمۂ قرآن اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے رسائل منگوا

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ص ۷۰

[2] حوالہ مذکور

کر پہلی مرتبہ یہ کتابیں چھپوائیں ..... مولانا ولایت علی جب حج کو تشریف لے گئے تو اسی سلسلے میں یمن اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی اور یمن کے نامور محدّث و عالم قاضی محمد بن علی شوکانی سے حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی بعض تصانیف ساتھ لائے"۔[1]

اس اقتباس سے بہ سہ وجوہ ان کی اہلحدیثیت نمایاں ہے۔

اولاً روزمرّہ کے مسائل سے عورتوں کو واقف کرانے کے لیے قرآن کے ساتھ کسی فقہی کتاب کے بجائے "بلوغ المرام" کی تدریس، جسے بالکل ابتدار میں کوئی حنفی پڑھنا پڑھانا پسند نہیں کرتا۔ جس دور کی یہ بات ہے۔ اس دور میں درس و تدریسِ حدیث کا رواج ویسے ہی شاذ و نادر تھا۔ سارا زور کتب فقہ پر صرف ہوتا تھا، اور آج کل بھی احناف میں یہ رواج عام ہے کہ چھ سات سال تک مسلسل فقہ اور دیگر علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے اور آخری ایک دو سالوں میں ھٰذًّا کَھَذِّ الشِّعْرِ دورۂ حدیث کرا دیا جاتا ہے۔

ثانیاً شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے رسائل کی اشاعت کا خیال ان کا کوئی ہم فکر و ہم مسلک ہی کر سکتا ہے۔

ثالثاً امام شوکانیؒ سے سندِ حدیث کا حصول، اہلِ علم اس بات سے بخوبی آشنا ہیں۔ کہ امام شوکانیؒ سلفی مسلک کے حامل اور تقلید کے سخت مخالف تھے۔ان کی تصانیف سے یہ بات بالکل نمایاں ہے، ان سے حدیث کی سند حاصل کرنا اور ان کی تصانیف کا اپنے ساتھ لانا اس بات کے لیے کافی گواہی ہے کہ مولانا ولایت علیؒ بھی تقلیدی جمود سے دور اور سلفی مسلک کے پیرو تھے۔

محترم مضمون نگار ... اب پروفیسر صاحب ایک دعویٰ یہ ... کر آئے ہیں کہ ... شاہ اسمٰعیل ... حدیث فکر کو آگے بڑھایا اور اپنے متبعین کی ایک جماعت پیدا کر لی۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ مولانا ولایت علیؒ حضرت شہیدؒ کی اس جماعت

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۶۰-۶۱

کے "خاص رکن" تھے، جس کا اعتراف مولانا عبیداللہ سندھی (حنفی) نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"پٹنہ کے مولانا ولایت علی مرحوم معرکۂ بالاکوٹ میں موجود نہ تھے۔ موصوف مولانا اسمٰعیل شہید رح کی اُس جماعت کے خاص رکن تھے جو مولانا شہید رح نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی، یہ لوگ رفع الیدین اور آمین بالجہر کیا کرتے تھے۔" [1]

اب اس کے بعد اس امر میں کیا شبہ رہ جاتا ہے کہ مولانا ولایت علی اہلحدیث تھے؟ تاہم مزید تنقیح کے لیے ہم ان کی تصانیف سے ان کے مسلک پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تاکہ بات بالکل واضح اور مبرہن ہو جائے۔

تصانیف کی روشنی میں

ان کی تصانیف کا ایک مجموعہ "مجموعہ رسائل تسعہ" کے نام سے چھپا ہوا ہے۔ جس میں سات رسائل خود مولانا ولایت علی مرحوم کے ہیں۔ اس مجموعے میں اوّلین رسالہ "ردّ شرک" ہے۔ اس کے آخر میں ایک قصیدہ ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں۔

صد حیف کہ عالمانِ ایں دہر — کردند شعار خود دغا را
قرآن و حدیث را بہ پوشند — تبدیل کنند مدّعا را
اے مومنِ پاک واے مسلمان — گرمی خواہی رہِ رضا را
قرآن و حدیث را بسر نہ — بگذار کلامِ ماسوا را [2]

یہ اندازِ بیان کسی سلفی کے قلم کا ہی مرہون ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرا رسالہ "عمل بالحدیث" ہے جو خاص طور سے اسی موضوع یعنی اتباعِ حدیث اور تقلیدِ ائمہ سے متعلق سوالات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس کے شروع میں وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص ۱۳۰

[2] مجموعہ رسائل تسعہ، صفحہ ۲۸ - ۲۹، مطبع فاروقی دہلی۔

"اتباع حدیث وفقہ کے بارے میں چونکہ اس فقیر کے پاس بکثرت سوال آتے رہتے ہیں ۔ اس لیئے میں نے دل میں سوچا کہ اس دفعہ اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ لکھ دوں جو ہر سائل کے سامنے پیش کر دوں تاکہ بار بار کی تکلیف بھی دور ہو جائے اور دوستوں کے پاس یادگار بھی رہے" لہ

یہ فارسی زبان میں انتہائی مختصر مگر انتہائی جامع اور پُر مغز رسالہ ہے سارا کا سارا نقل کرنے کے قابل اور اس کا ہر مقام، "دامن دل می کشد" کا آئینہ دار ہے تاہم اختصار کے پیش نظر اس کے صرف ضروری اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔ اس رسالے میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل دین کی سمجھ اور اس کی فضیلت کے بیان میں، دوسری فصل تقلید کے محل جواز و عدمِ جواز میں اور تیسری فصل قرآن و حدیث کے سہل ہونے کے بیان میں ہے۔ پہلی فصل میں تفقہ فی الدین کی فضیلت اور اس کی حقیقت بیان کرنے کے بعد قرآن و حدیث میں غور و فکر کرنے کے بارے میں لوگوں کے طرزِ عمل کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قرآن و حدیث کا دیکھنا اور اس میں تأمل کرنا بالکل موقوف کر دیا ہے اور جو بات کسی کتاب میں لکھی ہوئی دیکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے موافق ہو یا مخالف بے تکلف اس کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ان میں بعض تو مطلق قرآن و حدیث کو نہیں دیکھتے ہیں۔ اور بعض اگر دیکھتے بھی ہیں تو اس کے معنی میں تأمل نہیں کرتے ہیں۔ اور بعض اگر تأمل کرتے ہیں تو قیامت، برزخ اور ترکِ دنیا وغیرہ کی خبروں اور نصیحتوں مضامین کی طرف تو توجہ کرتے ہیں۔ جہاں تک احکام شرعیہ کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق یہ طے کر رکھا ہے کہ (پہلے فقہاء) اس پر غور کر کے فارغ ہو چکے اس طرف بالکل دھیان دینے کا ارادہ تک نہیں کرتے (بلکہ) اگر قرآن و حدیث میں اپنی مسلکی کتابوں کے خلاف کوئی حکم پاتے ہیں تو بعض لوگ تو

لہ مجموعہ رسائل تسعہ ص ۲۸ - ۲۹ مطبع فاروقی دہلی

قرآن وحدیث کے ظاہری معنی کو پھیر پھار کر اپنی کتابوں کے موافق کر لیتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے ہیں کہ مقصودِ اصلی تو قرآن وحدیث کی تابعداری ہے اور بعض آدمی ایسے مقام سے بھاگنا اور آنکھ چھپانا اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے فقہاؤں کے حال سے مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں خبر دی ہے۔ "رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ یعنی دانائی کی بات یاد رکھنے والے بہت سے غیر دانا (غیر فقیہ) ہیں" معاذ اللہ من کل ذلک عیاذًا کثیرًا۔ (ان تمام برائیوں سے خدا پناہ میں رکھے۔) پس ضروری ہوا کہ دوسری فصل میں اس بات سے آگاہ کردوں۔ کہ تقلید کس جگہ اختیار اور کس جگہ اس سے انکار کرنا چاہیئے"

(رسالہ "عمل بالحدیث" ص۱۵ طبع المکتبۃ السلفیہ لاہور ۱۳۸۵ھ)

پھر فصل دوم میں لکھتے ہیں۔

"جو آدمی ان پڑھ ہو اور اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے دور ہو اور علماء کے پوچھ لینے پر اکتفا کرتا ہو۔ تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ علمائے محدثین اور دیندار سے، جو دیانت، خوفِ خدا اور قرآن وحدیث کے جاننے میں مشہور ہوں، اس طرح سوال کرے کہ مجھے اس مسئلہ کے بارے میں محمدی طریقہ بتایئے"

یعنی ان کی نظر میں کسی جاہل کے لیے بھی تقلیدِ شخصی ضروری نہیں، نہ مسئلہ پوچھتے وقت وہ کسی ان پڑھ کو یہ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ نہ صرف کسی خاص امام کے ماننے والے سے اسی کی فقہ کے مطابق مسئلہ دریافت کرو، جس طرح اہلِ تقلید کا مسلک ہے۔ بلکہ وہ واضح الفاظ میں اس کو کہتے ہیں کہ صرف قرآن وحدیث کے عالم سے ہی بایں طریق مسئلہ پوچھے کہ اس بارے میں طریقہ محمدی کیا ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"اور اگر کوئی علم کا طالب دل میں دینی علوم کی تحصیل کا شوق رکھتا ہے تو

اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے قرآن وحدیث پڑھے، اس کے بعد دوسری کتابوں پر نظر ڈالے تاکہ آئینہ کی طرح ظاہر ہو جائے کہ کس بزرگ کی رائے نے کس جگہ امر حق کو پالیا ہے اور کہاں غلطی ہوئی ہے۔ پس جو مسئلہ قرآن وحدیث میں صاف صاف پائے اس میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کرے، کیونکہ کھلے ہوئے مسائل میں اجتہاد کو کچھ دخل نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ جب تک قرآن وحدیث میں حکم صراحتہً پاوے۔ تب تک اجتہاد کو دخل نہ دینا چاہیئے اور مجتہدوں کی کتابوں میں اگر اس کا خلاف نکل آئے تو اس سے چشم پوشی کر کے قرآن وحدیث کے ساتھ تمسک ضروری ہے۔ ورنہ مجتہدوں کے قول سے قرآن اور حدیث کا منسوخ ہونا لازم آئے گا۔ امام ابوحنیفہ جو اجتہاد کی راہ پر چلنے والوں کے سردار تھے۔ ان سے دو قول مروی ہیں۔ اوّل یہ کہ "اگر میرا قول حدیث کے خلاف پاؤ تو دیوار پر پھینک مارو۔" اس سے صاف معلوم ہوا کہ حدیث کی مخالفت میں مجتہدوں کا قول سننا اس امام کے دائرہ تقلید سے نکل جانے کی راہ ہے۔ ایسا کرنے والا ہرگز حنفی نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "میرے قول پر عمل کرنا کسی کو جائز نہیں جب تک یہ نہ جان لے کہ یہ قول میں نے کہاں سے کہا ہے۔" پس معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ کے قول سے بے سوچے سمجھے تمسک کرنا اور دلائل اور وجوہاتِ قیاس میں فکر و تامل نہ کرنا ہرگز امام صاحب کی پسند نہیں۔ پس حضرت امامؒ تو اپنے ارشاد کے باعث قیامت میں مواخذۂ الٰہی سے نجات پاویں گے۔۔۔۔۔۔ لیکن ان کے مقلدین ناسمجھ مواخذۂ الٰہی میں گرفتار رہیں گے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اماموں کے شاگردوں کو جس مقام میں اپنے استادوں کے قول سے اطمینان حاصل نہ ہوا، وہاں سے اپنا دامن اٹھائے ہوئے گزر گئے۔ امام محمدؒ نے امام اعظمؒ کے خلاف اس قدر کہا ہے کہ اس کو ایک مذہب علیحدہ، قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔

۔۔۔۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو قول قرآن وحدیث کے مخالف ہو اُس کے ترک

کر دینے میں کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔
علاوہ ازیں حدیثیں تو باسند ہیں۔ اور مجتہدوں کے اقوال بلا سند ہیں یعنی راویوں کے حال کی تحقیق اور ان کی ثقاہت وشہرت شرطوں کے ساتھ مذکور ہیں اور مجتہدوں کا قول جو ذکر کیے گئے ہیں تو اس کی کوئی سند نہیں بیان کی گئی کہ اماموں سے کس نے سنا اور اس سے کون روایت کرتا ہے اور راویوں کا کیا حال ہے۔ جب تک قول کی سند شرائط مذکورہ کے موافق نہ ہوگی وہ قول کیا اعتبار رکھے گا؟ کوئی کیا جانے کہ یہ امام کا قول ہے یا کسی دوسرے نے اپنے دل سے باندھ لیا ہے، جیسا کہ بعض نادان وسوسوں کی نقول محض جھوٹ امام اعظم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مجتہد کی رائے کبھی خطا کرتی ہے اور کبھی حق پر ہوتی ہے، پس معلوم ہوا کہ حدیث، جو ایک معصوم کا کلام باسند ہے، اس کے مقابل میں ایسا قول، جو بے سند اور محتمل خطا ہے۔ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔"

(رسالہ مذکورہ ص ۱۷ ـ ۲۰)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی حنفی مقلد حدیث و فقہ کے بارے میں اس طرح کے واضح خیالات بھی رکھ سکتا ہے یا اس طرح اس کا اظہارِ عام کر سکتا ہے؟ اگر احناف فی الواقع اسی نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ تو پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالا ہے، کہ اس کے بعد اہلحدیث اور حنفیت میں مابہ الاختلاف مسئلہ کیا رہ جاتا ہے۔؟

اہل تقلید کی طرف سے حدیث صریح کی مخالفت کے جواز میں ایک بات عموماً یہ کہی جاتی ہے کہ ہمارے امام نے بھی کسی حدیث ہی پر اپنے قول کی بنیاد رکھی ہوگی اگرچہ وہ حدیث اب ہمارے سامنے نہیں، یعنی وہ اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ قولِ امام سے کسی حدیث کی مخالفت بھی ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا ولایت علی لکھتے ہیں۔

"مجتہدین کے بہت سے اقوال جو حدیث کے خلاف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ

ان کے دور میں احادیث منتشر تھیں، ان کی باقاعدہ تدوین اس وقت تک نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے پیش نظر تمام احادیث نہ تھیں اور وہ اجتہاد وقیاس پر مجبور رہتے۔ (ص ۲۱)

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"بعض لوگ سمجھتے کہ لوگوں میں حنفی کہلانا بھی ضروریاتِ دین سے ہے۔ اس لیے اگر امام صاحبؒ کے ارشاد کی مخالفت ہوگئی تو حنفیت باقی نہ رہے گی۔ اس کے جواب میں قدرے تفصیلی گذارش ہے۔ کہ جتنے مسائل حضرت امامؒ کی طرف سے منسوب ہیں۔ وہ دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جو امام صاحب سے مروی ہیں، ایسی باتوں کو کُتبِ فقہ میں عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ لکھتے ہیں۔ اور دوسرے وہ مسائل جن کو دوسرے فقہاء امام صاحب کی باتوں سے نکال کر اُن کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ اور ایسے مسئلوں کو کُتبِ فقہ میں عند ابی حنیفۃ لکھتے ہیں، اور یہ اجتہاد دراجتہاد ہے۔ سو اوّل تو وہ دوسری صورت کے اقوال خود قرآن و حدیث سے استنباط کیے گئے تھے۔ پھر دوسری بار ان اقوال سے دوسرے مسائل نکالے گئے۔ اس طرح ان مسائل میں دو خطاؤں کا احتمال پیدا ہوگیا۔ کیونکہ ہر بار کے نکالنے میں احتمال ایک خطا کا ہے۔ اور انہیں وجہوں سے امام صاحب کے شاگرد اور دوسرے اہل علم بعض مقام میں مذہب امام سے علیحدہ ہو گئے ہیں، اور ان مقلدوں نے بھی اُس مقام میں دوسرے اہلِ علم کے نقطہ نظر کو اختیار کیا ہے اور امام کی تقلید کو چھوڑ دیا ہے۔ پس بعض جگہ حنفی ہوتے ہیں اور بعض جگہ ابو یوسفی اور محمدی (امام محمد کی طرف نسبت ہے) اور دوسری جگہ زفری اور کسی جگہ ابواللیثی، پس حنفیت ان کی کہاں باقی رہی ..... پس یہ گفتگو اس واسطے ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ تحقیق والوں کو حق کی پیروی مقصود ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کی طرف انتساب۔" (ص ۲۲-۲۳)

اس کے بعد انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے۔ کہ امام ابو حنیفہ سے سرے سے کوئی کتاب ہی منقول نہیں ہے۔ جس پر ان کے مذہب کی بنیاد رکھی جائے۔ حنفی فقہ کی کتابوں میں اکثر مسائل امام صاحب کے نہیں دوسرے حضرات کے ہیں۔ بنا بریں اگر کسی شخص نے ان کتب مشہورہ سے کوئی مسئلہ بسبب مخالفت قرآن یا حدیث کے یا بوجہ استنباطِ ناپسند کے نظر انداز کر دیا۔ تو اس سے کوئی نقصان لازم نہیں آئے گا اس کے بعد انہوں نے قیاسی مسائل میں بھی قرآن و حدیث کو مدارِ فکر و نظر بنانے پر زور دیا ہے

(ص ۲۳ - ۲۵)

تیسری فصل میں انہوں نے ثابت کیا ہے۔ کہ قرآن و حدیث کا سمجھنا اور ان پر عمل مشکل نہیں آسان ہے۔ دو ایک اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"قیامت کے روز اسی قرآن و حدیث کے بارے میں سوال ہو گا نہ کہ دوسری کتابوں کے متعلق۔ خوب سمجھ لیجیے کہ قرآن و حدیث کے علاوہ دوسری کتابوں کا مطالعہ یا تو منع ہے یا فائدے سے خالی ہے۔ ...." (ص ۲۸)

"اللہ تعالیٰ متقدمین محدثین کو غریقِ رحمت کرے کہ انہوں نے موضوع احادیث کو غیر موضوع سے اور قوی کو ضعیف سے جدا کر کے حسب مدارج اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے اور ہر مسئلے کے لیے علیحدہ علیحدہ باب اور فصلیں مقرر کر دی ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث میں جزوی مسائل بھی بے شمار ہیں۔ اب تو فن حدیث، فقہ کی کتابوں کی طرح، بالکل آسان ہو گیا۔ جو مسئلہ پیش آئے، اس کے باب میں دیکھ لیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند معلوم ہو جائے گی۔ بلکہ علمِ حدیث تو فقہ سے بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے، کیونکہ فقہ کی کتابیں بے شمار اور ان کے مؤلفین ہزارہا ہیں۔ اگر ایک مسئلہ ایک کتاب میں جائز لکھا ہے تو گمان غالب ہے کہ دوسری کتابوں میں ناجائز لکھا ہو گا، تو اب کس کے کہنے پر عمل کیا جائے، اور اتنی کتابیں کہاں سے لی جائیں اور اتنی فرصت و عمر کہاں سے آئے کہ جس

میں انسان ان کتابوں سے احکامِ الٰہی معلوم کرسکے۔" (ص ۳۰ - ۳۱)

ظاہر ہے کہ کوئی مقلد اپنی "فقہ" کے بارے میں یہ طرزِ فکر اختیار نہیں کرسکتا جو ان اقتباسات سے ظاہر ہے۔

مولانا کا ایک دوسرا رسالہ "تیسیر الصلوٰۃ" ہے جو مجموعہ "رسائل تسعۃ" میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں سات رسائل خود مولانا ولایت علی کے ہیں۔ یہ رسالہ آسان اردو میں ہے۔ جس میں نماز کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں بھی ان کا جذبۂ عمل بالحدیث بالکل نمایاں ہے۔ کئی مقامات پر انہوں نے حدیث کے پیش نظر حنفی فقہ کے مسائل کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً قُلّتین کا مسئلہ۔ شیر خوار لڑکے اور لڑکی کے پیشاب کے فرق کا مسئلہ، سفر کی حالت میں جمع تقدیم و جمع تاخیر کا مسئلہ، نماز جنازہ غائبانہ اور نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کے مسائل وغیرہا۔ ان تمام مسائل میں انہوں نے احادیث کے پیش نظر حنفی فقہ سے مختلف، اہلحدیث نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

اسی مجموعہ میں ایک کتاب ان کی "رسالۂ دعوت" ہے اس میں ہر جگہ اپنی جماعت اور متبعین کو "گروہ محمدی" سے تعبیر کیا ہے، اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ سلفی، اثری محمدی اور اہلحدیث ایک ہی مسمّٰی کے مختلف نام ہیں۔ اہلِ تقلید ان ناموں سے کبھی اپنے کو معنون نہیں کرتے۔ یہ نام اُسی گروہ کے لیے مخصوص ہیں جو براہِ راست قرآن و حدیث سے استفادہ کا قائل اور کسی امام کی تقلید کو ضروری نہیں سمجھتا، مزید برآں اُس وقت کے ایک انگریز نے بھی یہ شہادت دی ہے۔ کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے متبعین اپنے آپ کو "محمدی" کہتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جماعت مجاہدین دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی۔

"ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے۔ جو اہلِ سُنّت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسمٰعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے۔ خود سید احمد صاحب عمل کے اعتبار سے

حنفی تھے۔ مگر اسی کے ساتھ مولوی اسمٰعیل صاحب کی سرپرستی کرتے تھے۔ جو اپنے کو "محمدی" کہتے تھے۔" [۵]

ان ناقابلِ تردید داخلی دبیرونی شہادتوں کے بعد اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ کہ مولانا ولایت علی مرحوم مسلکاً کسی طرح بھی حنفی نہیں تھے۔ بلکہ اہلحدیث تھے۔ انہیں حنفی قرار دینا حقیقت نگاری نہیں مسخِ حقائق ہے۔ محترم پروفیسر صاحب کے اس ایک دعوے سے ہی ان کی تاریخ نگاری کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ انہوں نے تاریخی واقعات کو کس طرح غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ ع

قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

مولانا ولایت علی کی حنفیت کی حقیقت

اس وضاحت کے بعد اب یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ اگر فی الواقع مولانا ولایت علی اہلحدیث تھے تو انہوں نے اس اقتباس میں، جو پروفیسر صاحب نے نقل کیا ہے۔ اپنے کو "حنفی المذہب" کیوں کہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جس سیاق کلام میں انہوں نے یہ فقرہ کہا ہے، وہ اگر پورا سامنے رکھا جائے تو اس سے ان کی حنفیت کا وہ ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔ جو صاحبِ مضمون نے اس سے اخذ کیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری لکھتے ہیں۔

"آپ کی ترغیب تحصیل قرآن واحادیث اور وعظ و نصائح سے ملک ہندوستان میں عمل الحدیث کا چرچا ہوا اور تقلید و تعصب کی بنا کمزور و مضمحل ہونے لگی کیونکہ قرآن وحدیث کی محبت اور ان کی ترویج نے حق کو روشن کر دیا، جاء الحق و زھق الباطل۔ آپ اور آپ کے مریدان مسائلِ حنفیہ پر جب تک وہ کسی حدیث صریح غیر منسوخ کے مخالف نہ ہوتے، عمل کرتے۔ کیونکہ سارے عمل کا خلاصہ اللہ کی خوشنودی کا ڈھونڈھنا ہے۔ نہ کہ اختلاف پیدا کرنا، اگر یہ غرض پیشِ نظر رہے تو بیج اختلاف

---

[۵] مسلمانوں کا روشن مستقبل صـ ۱۰۴

خود خشک اور ڈھیلی پڑ جائے"۔ (تذکرہ صادقہ)

اس میں غور کر کے تبلایا جائے کہ وہ کیسے حنفی اور مقلد تھے جن کے وعظ و نصائح سے ہندوستان میں تقلید کی بنیاد کمزور اور مضمحل ہو گئی اور عمل بالحدیث کا چرچا ہوا۔ کیا کبھی کسی مقلد کے وعظ یا تبلیغ کا یہ اثر ہوتے دیکھا گیا ہے؟ یا کسی مقلد کے سوانح نگار نے بطورِ خاص اس کے اس پہلو کا ذکر کیا ہو؟ ظاہر ہے اس کا جواب سوائے نفی کے کچھ نہیں۔ اس اقتباس سے ان کا جو طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ حنفی مذہب کو قرآن و حدیث پر پیش کرتے تھے۔ جو مسائل ان کے موافق ہوتے، اُن پر عمل کرتے اور جو مخالف ہوتے اسے ترک کر دیتے تھے۔ جب کہ مقلدین کا عام شیوہ یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کو توڑ مروڑ کر اُسے قولِ امام کے موافق بنانے کی سعی مذموم کرتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ہم مناظرے کا وہ پورا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنے کو "حنفی المذہب" قرار دیا تھا۔ مؤلف "تذکرہ صادقہ" لکھتے ہیں۔

"اس ملت حقہ کی روز افزوں ترقی اور اشاعتِ قرآن اور احادیث دیکھ کر کوتاہ بین لوگوں نے مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری کو دو ہزار انعام کے وعدے پر علمائے حق سے مناظرہ کرنے کے لیے مدعو کیا۔ مناظرہ کے دن مولوی عنایت علی رحمۃ صاحب نے مولوی محمد فصیح کی مع ان کے ہمراہیوں کے دعوت کی، بہت سے علماء اور فضلاء اور خاص و عام جمع ہوئے (مگر مولانا ولایت علی) نے مولوی محمد فصیح کو علیحدہ کمرے میں لے جا کر دیکھو نکہ مجلسِ عام میں گفتگو ہونے سے انسان حق کے قبول کرنے سے شرم کرتا ہے اور اصرار پر آمادہ ہو جاتا ہے) بحاضری چند اشخاص ان سے فرمایا کہ میں حنفی المذہب ہوں اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی حنفی کسی حدیث صریح غیر منسوخ کو دیکھ کر کسی مسئلہ فقہی کے خلاف عمل کرے تو وہ مذہب حنفی سے خارج نہیں ہوتا، بفحوائے قولِ امام علیہ الرحمۃ اترکوا قولی بخبر الرسول "میرے قول کو حدیثِ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ترک کر دو۔"

یہ کلیہ مناظر صاحب کی فہم عالی میں آگیا اور انہوں نے حق کی طرفداری کرتے ہوئے باآوازِ بلند فرمایا کہ یہ جماعت حق پر ہے، احادیث الرسول پر عامل ہونے سے کوئی شخص حنفیت سے خارج نہیں ہوتا۔ ہمارا اور ان کا مسلک ایک ہے۔ اُس روز جلسہ برخاست ہو گیا مگر جب مناظر صاحب اپنے قیام گاہ، محلہ لودی کٹرہ، واپس گئے تو ان کے مریدوں نے اور جن لوگوں نے ان کو دعوت دی تھی۔ سخت خجل اور شرمندہ کیا اور آپ کو دوبارہ برسرِ عام بحث پر مجبور کیا اور چند دیگر علماء خصوصاً مولوی واعظ الحق صاحب کو ان کی تائید کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ مولوی محمد فصیح صاحب مع معاونین بحث کے لیے مولوی الٰہی بخش صاحب کے مکان پر تشریف لائے ۔۔ مولانا ولایت علی صاحب نے بحث کے لیے مولوی فیاض علی صاحب کو اور ان کی اعانت کے لیے مولوی حکیم ارادت حسین صاحب کو بھیج دیا۔ حکیم صاحب کتابیں کھول کھول کر مقاماتِ مبحوث عنہ دکھاتے جاتے۔ اس مرتبہ بھی مولوی محمد فصیح صاحب نے اعترافِ حق کیا، مگر اس بار ضرورۃً مباحث بالاختصار قلم بند کر کے مناظر مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری سے اقرارِ دستخطی کرا لیے گئے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ پابندِ مذہبِ حنفی اگر بوجہ ترجیح بالدلیل کسی حدیث صحیح غیر منسوخ پر مثل رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ کے عمل کرے تو وہ اپنے امام کی اتباع سے خارج نہیں ہوتا۔" [1]

خط کشیدہ عبارت سے صاحب مضمون نے ان کی حنفیت کشید کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں غور کیا جائے تو اس سے ان کا مسلک عمل بالحدیث نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے نہ کہ حنفیت، اس عبارت میں قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ

---

[1] تذکرہ صادقہ، ص ۱۱۹۔

وہ اپنے کو حنفی المذہب اس لیے نہیں کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک فقہ حنفی کے سب مسائل حق ہیں۔ اور اب ان مسائل کو قرآن و حدیث سے جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح کہ تقلید کا یہ تقاضہ اور اہل تقلید کا یہ شیوہ ہے۔ بلکہ وہ صرف اس اعتبار سے اپنے کو حنفی المذہب کہتے ہیں، کہ احادیث پر ان کا عمل امام ابو حنیفہ رح کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابلے میں میرا قول چھوڑ دو"۔ اس اعتبار سے گویا اصل حنفی ہم ہیں کہ ہم نے امام صاحب کے قول کے مطابق عمل کیا نہ کہ وہ مقلدینِ جامدین جو کسی حال میں بھی فقہی مسئلے کو ترک کرنے پر رضامند نہیں اور جو اس طرح خود اپنے امام کے مذکورہ قول کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ ایک اندازِ بیان ہے جو بحث و مناظرہ کی صورت میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ محض اس بات سے، ان کی اپنی تصریحات و تصانیف اور عملی زندگی سے قطع نظر کرکے حنفی قرار دینا ایسی جسارت ہے۔ جس کا ارتکاب پروفیسر قادری صاحب جیسے "محقق" ہی کر سکتے ہیں۔

مزید برآں ان کا اصل مشن چونکہ ردِّ شرک و بدعات اور باطل کے خلاف جہاد تھا۔ اس لیے بھی وہ ناموں کی بحث میں الجھنا پسند نہیں کرتے تھے، اگر وہ حنفی کہلا کر احادیث نبویہ پر عمل کرتے اور کراتے رہے، تو یہ بہر حال گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ خود اس واقعہ میں یہ مذکور ہے کہ حنفی مولوی صاحب نے رفع الیدین اور آمین بالجہر وغیرہ مسائل کی صحت کو تسلیم کرکے ان کا برسرِ حق ہونا تسلیم کر لیا تھا۔ اگر فی الواقع احناف حدیث و فقہ کے بارے میں بنیادی طور پر اُسی نقطہ نظر کے قائل ہو جائیں۔ جو مولانا ولایت علی مرحوم کا تھا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ پھر حنفی اور اہلحدیث میں کوئی وجہ اختلاف باقی نہیں رہتی۔ اہلحدیث، حنفی اور حنفی اہلحدیث ہو جاتے ہیں۔

بہر حال مولانا ولایت علی صادق پوری مرحوم بنیادی طور پر اہلحدیث تھے، اہلحدیث نقطہ نظر کی انہوں نے تبلیغ و اشاعت کی اور لاکھوں افراد ان کی صحبتِ کیمیا اثر اور پُر اثر وعظ و نصیحت سے تقلید کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر قرآن و حدیث کے

دالہ وشیدا ہوئے۔ چنانچہ مولانا عبدالرحیمؒ صاحب ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علیؒ کے متعلق، جنہیں مولانا ولایت علیؒ نے خطۂ بنگال میں تبلیغ کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"آپ نے بار اوّل مسلسل سات برس اس خطہ میں قریہ بہ قریہ نہایت جاں فشانی اور علم کے ساتھ گشت فرمایا، لاکھوں خلقت کو تیرہ ظلمت سے نکال کر شمع ہدایت کا گرویدہ کر دیا اور قرآن و حدیث کے اتباع کی طرف توجہ دلائی۔ جناب کے مسترشدین اور ان کی اولاد آج تک خطۂ بنگال میں محمدی کے لقب سے ممتاز ہے۔" [1]

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ ۱۹۱۲ء میں ایک مرتبہ بنگال کے دورے پر گئے۔ اور وہاں کے مختلف مقامات پر تشریف لے گئے۔ ضلع دمکا۔ ضلع مرشد آباد کے متعدد گاؤں مثلاً دلال پور، اسلام پور، جنگی پور اور سورج نرائن پور وغیرہ، واپسی پر انہوں نے وہاں کے مختصر حالاتِ سفر تحریر فرمائے۔ جو اخبار [2] اہلحدیث میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں خاص طور سے جماعت اہلحدیث کی کثرت پر تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"...... میں اس سفر میں یہ بات بھی سوچتا رہا کہ بنگال میں اہلحدیث جماعت کی اتنی کثرت کیسے اور کس ذریعے سے ہوئی؟ تو مجھے تبلایا گیا کہ جناب مولانا عنایت علیؒ اور مولانا ولایت علیؒ صاحبان کی یہ برکت ہے کہ کیا کوئی حنفی مقلد مسلکِ اہلحدیث کی تبلیغ بھی کر سکتا ہے؟ یا اس کی تبلیغ کا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ عوام تقلید کی بندھنوں سے نکل کر محمدی اور اہلحدیث نقطۂ نظر اختیار کر لیں، ظاہر ہے کہ یہ کسی مقلد کا کام نہیں۔ ایسا طرزِ عمل اسی شخص کا ہو سکتا ہے جو تقلید سے بیزار اور براہ راست قرآن و حدیث سے استفادہ و استنباط کا قائل ہو اور اسی تحقیق و جستجو کا نام اہلحدیث ہے۔ مولانا ولایت علیؒ بلاشبہ اسی طرزِ فکر و عمل

---

[1] تذکرۂ صادقہ، ص ۱۲۲

[2] "اہلحدیث" امرتسر ج ۱، ص ۲۵-۱۶، ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء

کے علم بردار اور داعی تھے۔

جب یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ مولانا ولایت علی اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی رحمہما اللہ سلفی ذہن اور اہلحدیث نقطہ نظر کے حامل تھے۔ تو ان کے تلامذہ و احباب اور اہلِ خاندان کا عامل بالحدیث ہونا آپ سے آپ متحقق ہو جاتا ہے۔ اور یہی دونوں بہادر اور مجاہد بھائی تھے۔ جنہوں نے سیدین کی شہادت کے بعد تحریکِ جہاد کو اُسی جذبے اور ولولے سے جاری رکھا جو جذبہ و ولولہ شہیدین رح کے اندر کار فرما تھا۔ اور ان دونوں بھائیوں کی رفاقت میں اور اُن کی رحلت کے بعد ان کے تلامذہ و احباب اور اہلِ خاندان نے اس علمِ جہاد کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی شہادت

گزشتہ تفصیلات سے اگرچہ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور دیگر اہلِ خاندان کا عامل بالحدیث ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ کے تحت مولانا عبید اللہ سندھی کا اعتراف بھی ملاحظہ فرما لیجئے!

مولانا سندھی لکھتے ہیں۔

"جب مولانا محمد اسماعیل شہید نے "حجۃ اللہ" امام عبد العزیز سے پڑھی تو اپنے جدِ امجد کے طریقے پر عمل شروع کر دیا، انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت، تیار کی جو "حجۃ اللہ البالغہ" پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے جیسا کہ سنن میں مروی ہے[1]۔"

اس سے آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسمٰعیل شہید رح کی اس خاص جماعت کو، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ

---

[1] "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" ص ۱۰۵، نیز ص ۱۲۱۔

کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔" [۱]

نیز ملاحظہ ہو۔

"مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔" [۲]

مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ کی اس جماعت کا، جو عمل بالحدیث میں ممتاز اور تقلید کی جکڑ بندیوں سے آزاد تھی، ایک انگریز سر جیمس اوکنلے نے بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس افراد کے جماعت اپنے کو "محمدی" کہا کرتے تھے۔ [۳]

اور صادق پوری خاندان اور ان کے پیروکاروں کے متعلق بہ صراحت گزر چکی ہے کہ وہ اپنے کو "محمدی" کہتے تھے۔

یہ تھا مولانا ولایت علی کا مسلک، جن کی تحریکِ جہاد سے وابستگی اور ان کی عظیم خدمات کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"فاجعۂ بالاکوٹ کے بعد تمام ملک پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، جماعت تتر بتر ہو گئی، اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، جہاد کا سارا کام درہم برہم ہوا چاہتا تھا کہ عظیم آباد پٹنہ محلہ صادق پور کے ایک فرد نے یہ گرتا ہوا علم اپنے ہاتھوں سے تھام لیا اور زندگی بھر اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ اور پھر اس فردِ کامل کے بعد اس کے بھائیوں، بھتیجوں، عزیزوں اور ماننے والوں نے جس طرح اپنے خون سے اس نخلِ خزاں دیدہ کی آبیاری کی ہے، وہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے" [۴]

---

[۱] "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" صفحہ ۱۲۲

[۲] " " " " " ۱۳۲

[۳] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" " ۸۷

[۴] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" ۲۳

مولانا غلام رسول مہر مرحوم لکھتے ہیں :۔

"مولانا ولایت علی رائے بریلی میں تربیت پا کر وطن گئے تو زندگی کا ایک ایک لمحہ وعظ و تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ انہیں کی کوشش سے ان کا خاندان اور دوسرے اعزہ و اقربا رسید (احمد) صاحب سے وابستہ ہوئے۔ مثلاً مولانا کے والد مولوی فتح علی، ان کے بھائی مولانا عنایت علی، مولانا طالب علی، مولانا فرحت حسین، ان کے اقرباء میں سے مولانا شاہ محمد حسین مولوی الٰہی بخش، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیاض علی، مولوی قمر الدین مولوی باقر علی، غرض ان سے تعلق رکھنے والوں میں ایک فرد بھی ایسا نہ رہا جس نے سید صاحب کی ارادت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈال لیا ہو اور ان حضرات کی قربانیاں تاریخ مجاہدین کا نہایت شاندار اور درخشاں باب ہیں" [۱]

یہ سارا صادق پوری خاندان اہل حدیث یعنی عامل بالحدیث تھا، جس طرح کہ ان کے سوانحی تذکروں سے، ان کی تصنیفات سے اور ان کی تبلیغی مساعی سے واضح ہے۔

علمائے اہل حدیث اور ان کے عوام کی یہ جہادی خدمات مولانا غلام رسول مہر کی "سرگذشت مجاہدین" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں جس میں انھوں نے ایک صدی کی یہ سرگذشت قلم بند کی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ان میں اکثر ایسے علماء داعیان کا تذکرہ ہے جو اہل حدیث تھے جنہوں نے ساری عمر جہاد کے ساتھ مسلک اہل حدیث کی تبلیغ و اشاعت میں گذاری انہیں میں قاضی قریشی (گوجرانوالہ) کے ان مجاہدین کا ذکر بھی ہے جنہیں کم کیس (۱۹۲۱ء) میں سزائیں دی گئیں۔ یہ خاندان بھی اہل حدیث تھا۔ قاضی عبدالرحیم مرحوم گوجرانوالہ بھی اس خاندان کے گل سرسبد چراغ تھے جو حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی شیخ الحدیث گوجرانوالہ کے معتمد ساتھی، صاحب علم و قلم الحدیث بزرگ۔۔۔ اور تحریک جہاد کے بقیۃ السلف کے سلسلہ زریں سے منسلک تھے۔ امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی سے بیعت جہاد کی ہوئی تھی،

---

[۱] "سرگذشت مجاہدین" ص ۲۲۶، ۲۲۷

اور ساری عمر مجاہدین کی خدمت اور انگریز کی مخالفت میں گزاری، ۲۷ فروری (۱۹۷۱ء) میں بعمر ۸۸ سال گوجرانوالہ میں انتقال فرمایا۔

قاضی عبدالرحیم رحمہ اور تحریکِ جہاد

حکیم عبداللہ خاں نصر مرحوم سوہدروی نے (جو قاضی صاحب کے شاگرد اور تحریکِ جہاد میں ان کے معتمد رفیق تھے) قاضی عبدالرحیم کی شخصیت اور ان کی خدمات پر ایک سلسلۂ مضمون "الاعتصام" میں شروع کیا تھا، لیکن افسوس وہ اسے مکمل نہ کر سکے اور مضمون کی صرف ۷ قسطیں چھپ سکیں۔ بہر حال اس مضمون میں تحریکِ جہاد سے وابستگی اور اس سلسلے میں ان کی خدمات کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ ہم اس کے ضروری اقتباسات ذیل میں پیش کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ اہلِ حدیث علماء نے علمائے صادق پور کے بعد کس طرح اس تحریکِ جہاد کو خفیہ طور پر زندہ رکھا اور کس بے پایاں اخلاص اور جذبے سے اس راہ کی صعوبتیں اور مشکلات برداشت کیں۔ حکیم عبداللہ خاں نصر مرحوم (متوفی جنوری ۱۹۷۸ء) اپنے اہلِ حدیث اساتذہ ورفقاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حالت یہ ہے کہ مجھے جب بھی ان خانہ برباد، پاکباز مجاہدین کی جاں سپاریوں اور سرفروشانہ اداؤں کا اور اسلام کے ازلی دشمن فرنگیوں سے ان کی دلی نفرت اور ان کے خلاف مجاہدانہ سرگرمیوں کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور اس راہ کے مصائب اور قید و بند کی برداشت کے واقعات یاد آتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جماعت کیا تھی؟ خلاصۂ کائنات تھی، انہیں خدا نے وہ عزم حوصلہ اور جرأت عطا کی تھی جو انبیاء کا ورثہ تھی، انہیں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ تعلیم سے یہ سب سعادتیں وافر طور پر بہم ہوئیں۔ انھوں نے حالات کی ناسازگاری کی حالت میں بھی انگریز کا ناک میں دم کیے رکھا۔ ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے واقعات ایسے ہیں جو ہر آن ایمان کو تازہ رکھتے ہیں۔"[1]

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

---

[1] "الاعتصام" لاہور ۹ اپریل ۱۹۷۱ء ص ۵

"جب میں حافظ عبدالمنان صاحب (وزیرآباد) کے مدرسے سے گوجرانوالہ جانے لگا تو مجھ سے امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی صاحب نے فرمایا کہ وہاں قاضی عبدالرحیم صاحب سے ملنا، وہ جماعتِ مجاہدین کے آدمی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر قاضی صاحب کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی کہ یہ ایک "تازہ وارد ہوائے دل" آرہا ہے، اس کی تربیت کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں قاضی صاحب اسی مسجد کی دکان میں (جس میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی کا مدرسہ تھا اور نصر صاحب وزیرآباد سے آکر وہاں زیرِ تعلیم تھے) مطب کیا کرتے تھے۔ اور یہ انتظام ایک اسکیم کے ماتحت تھا کیونکہ اس طرح مجاہدین کے کارندوں کو مسجد میں قیام کی سہولتیں میسر تھیں اور قاضی صاحب سے ان کے ملنے کی آسانیاں مہیا ہوتیں

اس زمانے میں مجاہدین کی تحریک میں شامل ہونا۔ ۵

یہ شہادت گہ میدان میں قدم رکھنا ہے لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کے مترادف تھا اور انگریزی حکومت اور اس کے کارندے مجاہدین کی بڑی سخت نگرانی کرتے تھے اور ملک میں جس قدر اہل حدیث مسجدیں اور مدرسے تھے، ان میں سی آئی ڈی کے محکمے نے اپنے آدمی بطور معلم، متعلم، مؤذن اور خادم متعین کر رکھے تھے اور ان جکڑ بندیوں میں ان رشیدانِ اسلام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان حریت اشعار مجاہدینِ اسلام نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، وہ انہی کا حصہ تھا ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ؟

انہوں نے برصغیر کے دور دراز علاقوں اور ملک کے کونے کونے سے کروڑوں روپے جمع کرکے اور مجاہدین کے گروہ در گروہ یاغستان میں مجاہدین کے مراکز اسمست اور چمرقند میں پہنچائے اور انگریزی سرکار کی انتظامیہ اور سرحد پر اس کا خصوصی متعین عملہ انگشت بدنداں تھا کہ یہ کس طرح کدھر سے ہماری آنکھوں میں خاک ڈال

پہنچتی تو خود مجاہدین کے اندر جو سی، آئی، ڈی کے آدمی حکومت نے داخل کر رکھے تھے اور جو ان مراکز میں مستقل طور پر مقیم تھے وہ یہاں کی حکومت کو مطلع کرتے کہ اتنا لاؤ لشکر، اس قدر روپیہ اور اتنا سامان فلاں تاریخ کو یہاں پہنچا اور یہاں کی حکومت پھر ان راہوں پر متعین اشخاص سے باز پرس کرتی اور انتظام پہلے سے زیادہ سخت کر دیا جاتا تھا۔ لیکن مجاہدین کا سیل تند رواں رکاوٹوں کو توڑتا ہوا اور انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتے ہوا رواں رہتا۔

وصدق ما قال ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا[1]

اس کے بعد حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

ہدایت کے مطابق میں قاضی عبدالرحیم صاحب سے ملاقات کا خواہاں رہا، اسی طرح وہ بھی مجھ سے ملنے کے آرزومند تھے۔ دل ہی دل میں ایک دوسرے سے ملنے کی جستجو تھی، لیکن برملا ایک دوسرے کا نام پوچھنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ تحریک کے آداب کے خلاف تھا کیونکہ اس میں افشائے راز کا احتمال تھا اور تحریک مجاہدین تھی بھی زیر زمین (انڈر گراؤنڈ) الغرض کچھ عرصے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ہیں قاضی عبدالرحیم صاحب اور انہیں بھی پتہ چل گیا کہ یہ ہے عبداللہ خان نصر۔ اس تعارف کے بعد اگرچہ تا حال بالمشافہ گفتگو کا موقع نہیں ہوا تھا لیکن ؎

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو چکے ہم تمہارے، تم ہمارے ہو چکے

.... میں ایک شب عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد قاضی صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور اب ہم دونوں مطب میں داخل ہو گئے۔ اس وقت تخلیہ تھا۔ قاضی صاحب نے فرمایا میں موقعے کی تلاش میں تھا کہ آپ سے کہیں تنہائی میں ملاقات ہو تاکہ کھل کر باتیں ہوں اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء

کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک مجاہدین جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک زمین دوز
(انڈر گراؤنڈ) تحریک ہے۔ ۱۸۳۱ء میں مجدد خلافت راشدہ حضرت
سید احمد بریلوی رحہ کی بالاکوٹ میں شہادت کے بعد تحریک جہاد و تبلیغ کا مرکز
پٹنے میں مقرر ہوا اور بنگال سے یاغستان تک زمین دوز تنظیم قائم کی گئی۔ اس
جماعت نے انگریز اور ہند کے غلبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان
کو دار الحرب قرار دیا اور جماعت کا نصب العین اس دار الحرب کو دار الاسلام
بنانا قرار دیا۔ اس کے بعد امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی، امیر المجاہدین امیر
عبدالکریم اور حافظ عبدالمنان صاحب محدث، وزیر آبادی کی خدمات جہاد
کا ذکر ہے۔ امیر عبدالکریم صاحب نے ۱۹۰۲ء میں امیر منتخب ہونے کے
بعد اپنا مرکز اسمست، کے مقام پر بنایا جو یاغستان کے آزاد علاقے میں
واقع ہے اور سب سے اہم کام یہ سرانجام دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں
اور یہاں کے سیاسی اور دینی رہنماؤں اور لیڈروں سے تعلقات قائم کیے۔
ان ہندوستانی مراکز کو ایک سلسلے میں منسلک رکھنے اور انہیں سرگرم عمل رکھنے
کے لیے ۱۹۰۶ء میں حضرت مولانا فضل الٰہی صاحب کو امیر المجاہدین ہند کا
منصب تجویز ہوا۔ اس کے بعد تحریک کا کام مولانا فضل الٰہی صاحب ہندوستان
میں کرتے رہے۔ اسی دوران ۷ر نومبر ۱۹۱۵ء کو گرفتار ہوئے اور انہیں جالندھر
جیل بھیج دیا گیا۔ اور وہاں بھی حضرت مولانا نے فرائض کو خوب انجام دیتے
رہے۔ جیل سے رہا ہو کر کچھ عرصے کے بعد ۱۱ر اگست ۱۹۲۰ء کو ہجرت کر کے
چمرقند (یاغستان) پہنچ گئے۔ مولانا عبدالکریم قنوجی جو کہ ایک معمر شخص تھے۔
اسی وقت چمرقند مرکز کے امیر تھے اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک اس منصب پر
فائز رہے۔ چنانچہ مولانا فضل الٰہی صاحب کے چمرقند پہنچنے کے کچھ عرصے بعد
مولانا عبدالکریم صاحب نے ۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو امارت کا عہدہ مولانا فضل الٰہی
کو تفویض کر دیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ یہ جماعت کا مختصر تعارف ہے

جس کا آپ کے علم میں آنا ضروری تھا اور ہم اس وقت حضرت امیر المجاہدین کی سرکردگی کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ . . . . اتنے میں ایک مریض آ گیا" (اور سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا) ۱؎

"کچھ دنوں کے بعد پھر ایک صحبت میسر آئی تو قاضی صاحب نے فرمایا۔ اُس دن میں نے آپ کو تحریکِ مجاہدین کے متعلق کچھ باتیں بتلائی تھیں۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ یہ تحریک حکومتِ برطانیہ کے دبدبے اور رُعب کے علی الرغم معرضِ وجود میں آئی ہے جو اس کے پندار کے لیے بمنزلہ چیلنج کے ہے۔ ہر چند یہ تحریک خفیہ اور زیر زمین ہے لیکن انگریزی حکومتِ ہند نے خفیہ پولیس کا ایک مستقل محکمہ صرف اسی تحریک کا کھوج لگانے کے لیے قائم کر رکھا ہے جس کا جال ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے ہمارے مبین و لیساران کے حلقے قائم ہیں ان کے افراد ہم میں اس طرح گھل مل کر رہتے ہیں کہ ہم ان کے متعلق غیریت اور بیگانگت اور مخبری کا کسی طرح شبہ کیا ایسا خیال کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں (اس کے بعد دو تین مثالیں انھوں نے ذکر کی ہیں) ۲؎

اور مضمون کی چھٹی قسط میں یہ شعر نقل کر کے ۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

اپنی بعض اُن خدمات کا ذکر کیا ہے جو حکیم عبد اللہ خاں نصر مرحوم نے قاضی عبد الرحیم مرحوم کی قیادت میں آگرہ اور اس کے نُوڈیوں کے سلسلے میں گوجرانوالہ میں انجام دیں ۳؎ رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ وغفرلہما

مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے بھی قاضی عبد الرحیم کی مہیا کردہ تحریکِ جہاد سے

۱؎ "الاعتصام" لاہور۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۷۱ء

۲؎ " ۲۸ر مئی، ۴ر جون ۱۹۷۱ء

۳؎ " ۱۶ جولائی ۱۹۷۱ء

متعلق بعض معلومات سے استفادہ کیا ہے اور ان کے مکتوبات کے حوالے سے انہیں ذکر کیا ہے [1]

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تحریک جہاد اور مجاہدین کی رُودادِ الم پر لکھی گئیں بعض کتابوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

" مگر آنسو کے ان چند قطروں سے اس پاک اور طاہر خون کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا جو مسلسل سو برس (۱۸۳۱ء — ۱۹۳۴ء) بنگال کے مشرقی اضلاع سے لے کر سرحد اور ماورائے سرحد کی پتھریلی اور پیاسی زمینوں تک بے دریغ بہایا گیا۔ حق یہ ہے کہ ان بلاکشانِ راہ عزیمت کا ادنیٰ حق بھی ابھی تک ادا نہیں ہو سکا ہے۔" [2]

اور واقعہ یہ ہے کہ شہیدین کے سانحۂ شہادت کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء۔۱۹۳۴ء تک یہ خون بہانے والے اہل حدیث ہی تھے اور اس پورے عرصے میں بلکہ اس کے بعد تک تحریکِ جہاد کی قیادت علمائے اہل حدیث ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اور انہی اہل حدیث علماء و اعیان اور ان کے عوام و تجار کی بے مثال جہاد سے وابستگی اور جان و مال کی بے بہا قربانیوں سے انگریز کے خلاف جہاد کا یہ شجرِ طوبیٰ پروان چڑھ سکا ہے جس کے گھنے سائے اور نتیجے میں استخلاصِ وطن کی وہ مختلف تحریکیں اٹھیں جن میں پھر متحدہ ہند کے تمام طبقوں نے درجہ بدرجہ حصہ لیا۔ اس پوری صدی (۱۸۳۱ء — ۱۹۳۴ء) کی رُودادِ الم، جاں سپاری و سرفروشی کے واقعاتِ دل گداز اور ایثار و استقامت کی یہ لازوال داستان مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی "سرگذشتِ مجاہدین" میں تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہے۔ جس میں اگرچہ انھوں نے بالعموم مسلک کی نشاندہی سے گریز کیا ہے لیکن سہ

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی   کہے دیتی ہے شوخی نقشِ کفِ پاکی

کے مصداق ان کا عمل و کردار ان کے عامل بالحدیث ہونے کی واضح شہادت دے رہا ہے اور بالآخر

---

[1] ملاحظہ ہو "سرگذشت مجاہدین" صفحہ ۶، ۷، ۶۱۳، ۶۱۵، ۶۱۶

[2] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" ص ۵۰-۵۱ - طبع جدید - لاہور

انہیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ :۔

"میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس نظام کے تمام کارکنوں کی سرگزشت ہائے حیات معلوم ہو سکیں یا نہ ہو سکیں، لیکن ممتاز افراد کے پورے کام کی کیفیت تو سامنے آجانی چاہیے۔ لیکن دس بیس اصحاب کے سوا کسی کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا اور ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہ بتایا گیا کہ وہ اس نظام سے وابستہ تھے مثلاً بہار میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا عبداللہ غازی پوری، پنجاب میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولوی ولی محمد فتوحی والہ، مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی، حافظ محمد صدیق، ترلام اور بمبئی میں حافظ عبدالغفور، مدراس میں کاکا عمر صاحب، دہلی میں پنجابی اہل حدیث، کلکتے میں کپڑے اور لوہے کے اہلحدیث تاجر گویا آخری دور میں اعانت مجاہدین کا اکثر و بیشتر کام زیادہ تر اہل حدیث حضرات ہی نے انجام دیا ہے۔" [۱]

اور آخری دور کے تحریکِ جہاد میں حصہ لینے والے علماء و قائدین کی اہلحدیثیت اس لیے نمایاں رہی کہ برادرانِ یوسف کی ایک کھیپ دیوبند سے تیار ہو کر اُس تحریک عمل بالحدیث کی مزاحمت کے لیے کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدانِ عمل میں اُتر چکی تھی جو تحریکِ جہاد کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چل رہی تھی اور یوں آخری دور میں علمائے اہلحدیث کو تحریکِ جہاد کے ساتھ ساتھ تقلیدی جمود کے خلاف بھی معرکہ آرا ہونا پڑا جب کہ تحریکِ جہاد کے ابتدائی دورِ ثانی [۲] میں تقلیدی جمود تو موجود تھا لیکن اس کے داعیان اور محافظین کی وہ جماعت موجود نہ تھی جو مدرسہ دیوبند کے فضلاء کی صورت میں بعد میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس لیے دورِ ثانی کے ابتدائی قائدین و علمائے صادق پور وغیرہ کو تقلیدی جمود کے مقابلے میں خم ٹھونک کر میدان میں آنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دورِ ثانی کے یہ ابتدائی

---

[۱] "سرگزشتِ مجاہدین" ص ۶۱۲

[۲] خیال رہے ۱۸۳۱ء سانحہ بالاکوٹ تک کے دور کو تحریکِ جہاد کا دورِ اول کہا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد کے دور کو دورِ ثانی۔ یہ دورِ ثانی ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ تک محیط ہے۔

تائدین (مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی) ان کے صاحبزادگان، احباب، تلامذہ، اور دیگر اہلِ خاندان صادق پور) اہلِ حدیث تھے اور فقہی و تقلیدی جمود سے بیزار اور اس کے مخالف تھے

اہلِ تاریخ علماء کا اعتراف

جماعت اہلِ حدیث کی یہ مجاہدانہ مساعی اور کارنامے اتنے واضح ہیں کہ اُن اہلِ علم حضرات جن کا موضوع تاریخ یا اس سے ان کو لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے برملا اس کا اعتراف کیا ہے چنانچہ ہم یہاں اس سلسلے کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:۔

"اہلِ حدیث کے نام سے ملک میں اس وقت بھی جو تحریک جاری ہے۔ حقیقت کی رو سے وہ قدم نہیں، صرف نقشِ قدم ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جس تحریک کو لے کر اُٹھے، وہ فقہ کے چند مسائل نہ تھے بلکہ امامتِ کبریٰ، توحیدِ خالص اور اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیمات تھیں، مگر افسوس ہے کہ سیلاب نکل گیا اور باقی جو رہ گیا ہے وہ گزرے ہوئے پانی کی نشانِ علامت ہے۔
بہرحال اس تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانے سے آج تک ہمارے دورِ ادبار کی ساکن سطح میں اس سے جو جنبش ہوئی وہ بھی ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائقِ شکریہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھاری گئی، قرآنِ پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا، قرآن پاک سے براہ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا، حدیثِ نبوی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی دیہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں) لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباعِ نبویؐ کا جو جذبہ گم ہو گیا تھا وہ سالہاسال تک کے لیے دوبارہ پیدا ہو گیا مگر افسوس ہے کہ اب وہ بھی جا رہا ہے۔ اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ "جہاد" جس کی آگ اسلام کے مجمر میں

ٹھنڈی پڑ گئی تھی، وہ پھر بھڑک اُٹھی یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سُولیوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پا بجولاں دریائے شور عبور کر دیئے گئے یا تنگ کوٹھڑیوں میں انہیں بند ہونا پڑا۔ اور اب پردہ کیسا صاف کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (متوفی ۱۹۱۸ء) کی زندگی تک اس تحریک کے عَلَم برداران میں یہ رُوح کام کر رہی تھی ......

اس تحریک کی بُنیاد تین چیزوں پر تھی (۱) نصب امارت (۲) زکوٰۃ کی مرکزیت (۳) اسلام سے تمام بیرونی اثرات کو مٹا کر اس کو پھر اپنی اصلیت پر لوٹانا....

علمائے اہل حدیث کی تدریسی و تصنیفی خدمت بھی قدر کے قابل ہے (اس کے بعد اس کی کچھ تفصیل کی ہے") [1] ..

۲۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ جماعت اہل حدیث کے اجتماعات میں جماعت کی مذکورہ خوبیوں کو تسلیم کرنے اور ان کا اعتراف کرتے ہیں۔ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ (بہار۔ ہند) کے ایک اجتماع میں انھوں نے فرمایا۔

"ہندوستان میں تحریک اہل حدیث جن بنیادوں پر قائم ہوئی، وہ بنیادیں چار تھیں۔ عقیدۂ توحید، اتباعِ سُنّت، جذبۂ جہاد اور انابت الی اللہ... جماعت انھیں چار چیزوں کا مجموعہ تھی۔ دوسرے لوگوں میں دیکھئے کہ اگر توحید ہے تو اتباعِ سُنّت میں کوتاہی ہے، اگر اتباعِ سنّت کا جذبہ ہے تو جذبۂ جہاد مفقود ہے اگر کہیں ذکر و فکر ہے تو اتباعِ سنت نہیں ہے۔ غرضیکہ لوگوں نے خاص خاص چیزوں کو لے کر انہیں کو عمل کا دار و مدار بنا لیا ہے بخلاف اس کے جماعت اہل حدیث میں چاروں خصوصیتوں کا اجتماع ہو کر شہیدین کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور جس جماعت نے ان چاروں کا مظاہرہ بیک وقت کیا وہ جماعتِ صادق پور ہے جن کا خلوص اور تعلق مع اللہ ہر شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چاروں خصوصیتوں کی جامعیت کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا اور بڑی سے بڑی تحریکیں ان کے بغیر کسی طرح کے ٹھوس

---

[1] مقدمہ تراجم علمائے حدیث، ہند" ص ۲۱-۳۲- طبع دوم

نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو ان سے ہوا۔ طبیعتوں کو بدلنا، رسموں کو پھیر دینا اور قلوب کو حرارتِ ایمانی سے بھر دینا نہ تو اعلانات سے ہوتا ہے اور نہ کسی دوسری چیز سے۔ یہ اسی جامعیت سے ہوتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ۔ لوگوں میں جب تک یہ جھلک نظر نہ آئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب کی جماعت کے اندر دعوت و عزیمت کا خاص وہی اہتمام تھا جو کئی سو سال پہلے کے مسلمانوں کا امتیاز تھا۔ . . . . . ."

(اس کے بعد مولانا نے علمائے صادق پور کے بعض واقعات بطورِ مثال بیان کیے ہیں)[1]

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد جماعت اہل حدیث کے اس سیاسی و جہادی پہلو کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:۔

"اس زمانے میں ہندوستان میں وہابیوں کی جانب سے گورنمنٹ ہند نہایت برافروختہ تھی اور ان کی جماعت سخت خطرناک پولیٹیکل جماعت سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ جماعت مولانا اسماعیل رح کی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ جنھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد مسئلہ جہاد پر رکھی تھی اور سکھوں سے عملاً جہاد کیا تھا۔ مولانا اسماعیل کے بعد سید صاحب کی جو جماعت سرحد پر رہ گئی تھی وہ مولانا صادق پوری کی امارت میں از سرِ نو قائم ہوئی اور اس کی انگریزوں سے دو تین مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی تھی اور گورنمنٹ کو خیال ہو گیا تھا کہ اب یہ جماعت انگریزوں سے جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غدر میں سپاہیوں نے جو فتوے مرتب کیے تھے، ان پر بعض وہابی علماء کی مہریں تھیں۔ ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ جماعت ملک میں قلیل تھی اور سوادِ اعظم سے سخت مذہبی مخالفت برپا تھی۔

---

[1] اخبار "الہدیٰ" دربھنگہ، ۱۶ جولائی ۱۹۶۱ء۔ اسی مدرسہ احمدیہ سلفیہ (اہل حدیث) کے جلسہ دستار بندی میں مولانا موصوف نے مارچ ۱۹۸۴ء میں بھی خطاب فرمایا اور اس میں بھی انھوں نے جماعت اہلحدیث کے متعلق یہی اعتراف کیا ہے اور ان کی یہی خصوصیات بتلائی ہیں۔ مولانا محترم کا یہ خطاب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ بابت ۲۵ مئی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا ہے۔

مخالفین اسے نقصان پہنچانے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کرتے تھے ایک بڑی کوشش یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ کو یقین دلاتے تھے کہ یہ جماعت اس کے برخلاف ہے اور جہاد کرنا چاہتی ہے جس کے باور کرنے میں گورنمنٹ کو زیادہ پس وپیش نہ ہوا، کیونکہ جو مشہور خاندان وہابیوں کے بنگال اور پٹنے کے گرفتار ہوئے تھے ان کے یہاں ایک بہت بڑی تعداد ایسی تحریرات کی برآمد ہوئی جن میں انگریزوں کے خلاف دعوت جہاد دی گئی تھی۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جماعت عام طور پر اس کا اعلان بھی کرچکی تھی اور اس موضوع پر بعض کتابیں بھی لکھی گئی تھیں۔ ان اسباب سے اس زمانے میں گورنمنٹ کو جس کسی پر وہابی ہونے کا شبہہ ہوجاتا، فوراً گرفتار کرتی۔ مقدمہ چلاتی، پھانسی ورنہ کم از کم کالے پانی یا حبس دوام کی سزا دیتی۔ چنانچہ اس جماعت کے سینکڑوں علماء، اُمراء، تاجر کالے پانی بھیجے جاچکے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ جن پر مقدمے چلائے جاتے تھے ان کے تمام اہل وعیال بھی تباہ ہوجاتے تھے، کیونکہ یا تو وہ بھی گرفتار ہوتے تھے ورنہ جائداد کی ضبطی کی وجہ سے خود بخود تباہ ہوجاتے تھے۔ چنانچہ مشہور مقدمہ وہابیان بنگالہ اور خاندان صادق پور کے نتائج یہی ہوئے۔ جو بہت متمول تھے۔ اسی طرح کلکتے کے مشہور تاجران چرم امیر خاں اور حشمت خاں کے خاندان بھی برباد ہوئے۔"[1]

۴۔ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڈھ ہند) نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" پر، جو ان کی چند عربی تقریروں کے اُردو ترجمے پر مشتمل ہے، تبصرہ کرتے ہوئے اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے کہ اس کتاب میں جماعت اہل حدیث کے دینی وعلمی مراکز کا ذکر نہیں کیا گیا ہے حالانکہ سید صاحبؒ کے بعد اس تحریک کو اسی جماعت نے زندہ رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"دینی وعلمی مراکز کے تذکرے میں انجمن ترقی اُردو اور جماعت اہل حدیث اور ان کے اداروں کا ذکر نہ کرنا تعجب خیز معلوم ہوا، حالانکہ سید صاحبؒ کے بعد اس تحریک کو واقعی اسی جماعت کے افراد نے زندہ رکھا۔"[2]

---

[1] "مولانا آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی" حالی پبلشنگ دہلی صفحہ ۴۸۔۸۵

[2] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ (ہند) دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۸۴

۵۔ اسی طرح انگریز مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں یہ اعتراف کیا ہے کہ اس کے نزدیک وہابی اور رفتار ہم معنی ہیں[1] علاوہ ازیں اس کتاب میں اس نے یہی ثابت کیا ہے کہ انگریز کے خلاف شورش و بغاوت میں ہندوستان کے جو مسلمان سرگرم ہیں، ان میں سرفہرست وہابیوں ہی کی جماعت بالخصوص پٹنہ کے صادق پوری خاندان اور ان کے متبعین ہیں۔ وہ انگریز کے خلاف ان کی عزیمت و استقامت کا اور اس راہ میں کا مظالم و مصائب برداشت کرنے اور ان کے خلوص و تدبر کا اقرار کرتا ہے۔ اس کتاب سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ ایک جگہ یہ انگریز مصنف لکھتا ہے۔

"ایک دفعہ پھر ان مجنونوں کی تحریک تباہی کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ مگر پٹنہ کے خلیفوں کے تبلیغی جوش اور رپال و دولت نے جو ان کے تصرف میں تھی، مقدس جھنڈے کو خاک سے اٹھا کر ایک بار پھر بلند کر دیا۔ انھوں نے تمام ہندوستان میں اپنے مبلغ دوڑا دیے اور مذہبیت کو اس حد تک زندہ کیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ان دونوں خلیفوں (یعنی ولایت علی اور عنایت علی صادق پوری) نے بذات خود بنگال اور جنوبی ہند کا دورہ کیا، چھوٹے چھوٹے مبلغین بے شمار تھے" ....

آگے چل کر لکھتا ہے۔

"انگریزوں کے خلاف ضرورت جہاد پر اگر وہابیوں کی نظم و نثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال کی پیش گوئیوں سے پر اور ضرورت جہاد کے لیے وقف ہے۔ ان کتابوں کے محض نام ہی سے ان کے تمام و کمال باغیانہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔"[2]

اس کے علاوہ وہ جعفر تھانیسری، مولانا یحییٰ علی جیسے مجاہدین کے عزم و استقامت اور تدبر

---

[1] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص ۱۱۳۔ ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین۔ قومی کتب خانہ لاہور۔

[2] " " " ص ۷۷، ۸۸، ۱۰۳۔ نیز ۱۱۲

دانشِ ہندی کو یہی بر ملا خراجِ تحسین پیش کرتا ہے جو اہل حدیث تھے۔ [1]

۶۔ "ہندوستان میں وہابی تحریک" کے مصنف ڈاکٹر قیام الدین احمد نے متعدد جگہ صادق پوری خاندان کی مجاہدانہ خدمات، ان کی بے مثال عزیمت و استقامت اور تحریکِ جہاد سے ان کی والہانہ اور سرفروشانہ وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ ویسے تو یہ ساری کتاب ہی قابلِ مطالعہ ہے جو وہابیوں کی سرفروشی کی داستانوں اور انگریز کے خلاف ان کے عزم و جذبے کی تفصیلات پر ہے تاہم ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

خاندانِ صادق پور کے بارے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:۔

"یہ وہ خاندان ہے جس کی جدوجہد سید احمد شہید رح کی شہادت کے بعد اس تحریک کی تاریخ پر حاوی و غالب ہے اور جس نے اپنی بے مثال تبلیغی جوش سے اس تحریک کو بنگال، بہار اور دکن تک پھیلا دیا۔ اور یہ پٹنہ عظیم آباد ہی تھا، جہاں سب سے پہلے آئندہ کشمکش اور آویزشوں کے لیے مجاہدوں کو بھرتی کرنے اور سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے مستقل تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی [2]....."

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

"یہ قابلِ توجہ حقیقت ہے کہ نصف صدی سے زیادہ ایک زبردست غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک زوردار تحریک کی قیادت کا عملاً سارا بوجھ ایک واحد خاندان اہلِ صادق پور نے اٹھایا۔ انھوں نے محاربین و غیر محاربین دونوں کے کاموں کی نگرانی کی اور دونوں مرکزوں میں کام کیے اور یہ سب کچھ انہوں نے اُس زمانے میں کیا جب کہ انہیں کے بہت سے ہم وطنوں کی طرف سے تعاون درکنار، قدردانی کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ یہ ہے ملک کی آزادی کے لیے ان کے خود فراموشانہ جوش اور قربانیوں کے جانچنے کا حقیقی معیار۔" [3]

---

[1] حوالۂ مذکور صفحہ ۱۳۵، ۱۴۳، اور ۱۴۴، ۱۴۷

[2] "ہندوستان میں وہابی تحریک" صفحہ ۶۵ اور صفحہ ۲۶۳

[3] " " " " "

۷۔ ایک بنگالی مصنف اٹھارہویں صدی کے نصف دوم اور انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مختلف شورشوں کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہوئے وہابی تحریک کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں رائے زنی کرتا ہے۔

"وہابی تحریک کی مقبولیت عام نے اپنی مضبوط و مربوط تنظیم سے ملک کے طول و عرض میں ڈھاکہ سے پشاور تک کے رنگروٹ اور روپے حاصل کر کے اپنا بول بالا کر لیا۔ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جن تحریکوں کو جنم دیا، ان میں وہابی تحریک سب سے زیادہ بے دردی اور سختی سے مخالف انگریز تھی اور ان کی تمام جدوجہد میں یہ صورت قائم رہی۔" [1]

۸۔ دارالعلوم دیوبند کی ایک فاضل اور نامور شخصیت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی، جن کا انتقال ماہ مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں ہوا، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں جماعت اہلحدیث کے علماء بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان علمائے اعلام کی آراء اس لیے اور بھی لائق توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ کے زیر قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا۔ اور اسی بنا پر انگریز انھیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔

(برہان دہلی۔ اگست ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۵ مضمون "ہندوستان کی شرعی حیثیت")

---

[1] ایس بی چودھری مصنف CIVIL DISTURBANCES DURING THE BRITISH RULE IN INDIA کلکتہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۵۰۔ بحوالہ "ہندوستان میں وہابی تحریک" صفحہ ۸ - ۳۵۶

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وہابی مجاہدین کا حصّہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، غدر کا ہنگامہ تھی یا کسی صحیح مقصد کے لیے جہاد کا ایک حصّہ یا قومی جنگ؟ اس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے تاہم یہ بات واضح ہے کہ وہ تحریکِ جہاد سے متعلقہ چیز تھی، اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجاہدین چونکہ ایک دینی نظام سے وابستہ تھے، اس لیے وہ اس قومی جنگ میں غیر جانبدار رہے[۵۲] لیکن بعض دوسرے مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اس قومی جنگ میں بھی وہابی مجاہدین نے اپنے دوائر میں حصّہ لیا ہے اور واقعات کے لحاظ سے یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء میں بھی مجاہدین کی انگریزی فوج سے لڑائی اور مڈھ بھیڑ کا ثبوت ملتا ہے، جس کا ذکر ولیم ہنٹر نے "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں بھی کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی "سرگزشتِ مجاہدین" میں اس کی وہ ضروری کارروائیاں بیان کی ہیں جو حالات کی ناسازگاری کے باوجود، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مجاہدین نے سرانجام دیں[۵۳]

---

[۵۲] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" صفحہ ۶۹، طبع جدید۔

[۵۳] "سرگزشتِ مجاہدین" صفحہ ۲۹۱-۳۰۱۔

علاوہ ازیں خلیق احمد نظامی نے بھی بدلائل اس امر کی تردید کی ہے کہ وہابی مجاہدین نے اس جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ وہ "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"تحریک (یعنی ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کی تحریک) میں عملاً حصہ لینے والے بہت سے افراد سید احمد شہید کے افکار و نظریات سے متأثر معلوم ہوتے ہیں بخت خاں کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی جماعتِ مجاہدین ہی سے متعلق تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمے کے دوران میں ان کو "وہابی العقیدہ" بتایا گیا تھا کوئی شخص بھی جس نے ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" پڑھی ہے، اس سے انکار نہیں کرے گا کہ وہابی کا لفظ اُس زمانے میں سید صاحب اور ان کے ہم خیال علماء کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اور (بقول ہنٹر "وہابی" اور "غدار" ہم معنی الفاظ تھے۔ بخت خاں نے علماء سے جس نوع کے تعلقات رکھے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید صاحب کی تحریک سے متأثر تھے۔ جس وقت وہ تحریک میں حصہ لینے کے لیے دہلی پہنچے تھے تو علماء ان کے ہمراہ تھے دورانِ ہنگامہ میں وہابی علماء کی ایک جماعت ٹونک سے ان کے پاس آئی تھی، اس کے علاوہ جے پور، بھوپال، ہانسی حصار اور آگرہ سے بھی کافی علماء کھنچ کھنچ کر ان کے گرد جمع ہو گئے تھے ..... مولانا لیاقت علی الہ آبادی بھی اسی مکتب خیال کے مجاہد معلوم ہوتے ہیں ..... مولانا عنایت علی صادق پوری جن کی کوششوں سے مردان میں رجمنٹ ۵۵ نے بغاوت کی تھی، سید صاحب کے خلیفہ اور جماعتِ مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔ مولانا عبدالجلیل شہید علی گڑھی، جنھوں نے فرنگی قوت سے دلیرانہ مقابلہ کیا، سید صاحب کے خلفاء میں سے تھے۔ ان چیدہ شخصیتوں کے علاوہ ۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لینے والے اور بہت سے اشخاص سید صاحب کی جماعت یا ان کے مکتبِ خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ اور غالباً اسی بنا پر بعض لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو مسلمانوں کی تحریک قرار دیا تھا"[۱]

---

[۱] "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" صفحہ ۱۵-۱۶، ندوۃ المصنفین، دہلی

ایک انگریز مصنف کی رائے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ "وہابی" اس تحریک میں پیش پیش تھے محض یہ بات کہ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم ہو جانے کے بعد "وہابیوں" کو سخت سزائیں دی تھیں اور اس مکتب خیال کے لوگوں کو پسپا کیا تھا، تحریک میں ان کا حصہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔" [1]

"ہندوستان میں وہابی تحریک" کے مصنف نے بھی ۱۸۵۷ء کی اُن سرگرمیوں کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جو وہابی مجاہدین نے سرانجام دیں۔

بہرحال مقصود اس تفصیل سے یہ ہے کہ ۱۸۳۱ء میں سیدین شہیدین کی شہادت کے بعد صادق پوری خاندان نے علم جہاد اور تحریک کی قیادت کو جس طرح سنبھالا وہ تاریخ حریت اور عزیمت واستقامت کا ایک روشن باب ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی قیادت اگرچہ وہابی مجاہدین کے ہاتھ میں نہیں تھی تاہم ان کی شرکت اس میں ضرور رہی ہے۔

---

[1] "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" صفحہ ۱۵-۱۶ - ندوۃ المصنفین، دہلی۔

مولانا بٹالویؒ اور جماعت اہل حدیث

ایک مغالطے کی وضاحت

خیال رہے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "وہابی" سے مراد صرف اہل حدیث نہیں ہیں بلکہ بلا لحاظ مسلک و مشرب ہر وہ شخص وہابی ہے جس نے انگریز کے خلاف تحریکِ جہاد میں حصہ لیا۔ اس میں حنفی اور غیر حنفی دونوں شامل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سید احمد شہید رحمہ کی حیات تک بلاشبہ حنفی اور اہلحدیث دونوں تحریک میں شامل تھے لیکن پھر تدریج احناف اس سے الگ ہوتے چلے گئے۔ جیسے مولوی محبوب علی دہلوی[1] اور مولانا کرامت علی جونپوری[2] وغیرہم حتٰی کہ سانحہ

---

[1] مولوی محبوب علی خود ہی الگ نہ ہوتے بلکہ تحریکِ جہاد کے خلاف ایک محاذ کھول لیا۔ اور تحریک کو خاصا نقصان پہنچایا۔ چنانچہ مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں "مولوی محبوب علی کے اغواء سے کاروبارِ جہاد کو جو صدمہ پہنچا ویسا صدمہ اس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا"

(حیات سید احمد شہید رحمہ ۲۳۶ نفیس اکیڈمی، کراچی)

[2] مولانا کرامت علی جونپوری سید احمد شہیدؒ کے خلفاء میں سے تھے لیکن تحریک سے الگ ہو کر انہوں نے انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا تھا (تذکرہ علمائے ہند) صفحہ ۲۹۶، اردو ترجمہ از محمد ایوب قادری) یہ فتویٰ دراصل ایک تقریر ہے جو ایک مذاکرہ علمیہ میں موصوف نے کی تھی، جس کی رُوداد "اسلامی مذاکرہ علمیہ" کے نام سے ہی چھپی تھی، موصوف نے اپنی اس تقریر میں اس عقیدے کو کہ ہندوستان دارالحرب ہے صرف وہابیوں کا عقیدہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ تمام حنفیوں کے نزدیک ہندوستان دارالاسلام ہے (ملاحظہ ہو مذاکرہ علمیہ ص ۹ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۰ء) اور ایک انگریز مصنف جیمس اوکنلی کے مطابق "مولوی کرامت علی برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے" اور بقول مولانا مسعود عالم ندویؒ "عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے بالکل الگ تھے" (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۴۷، حاشیہ)

بالاکوٹ کے بعد اس کی قیادت صادق پوری خاندان کے ہاتھ میں آ گئی جو عامل بالحدیث تھا اور اسی خاندان اور اس کے ہم مسلک افراد نے پھر اس تحریک جہاد کو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک زندہ رکھا، یہاں تک کہ وہابی (اہلحدیث) اور باغی مترادف الفاظ بن گئے۔ اس لیے بعد میں یہ وہابی کا لفظ اہلحدیث جماعت کے افراد ہی کے لیے خاص ہو گیا اور اس سے مراد ہمیشہ اہل حدیث ہی سمجھے گئے۔ اور یہ لفظ وہابی اہلحدیث کے ساتھ اس طرح لازم و ملزوم ہو گیا کہ مولانا محمد حسین بٹالوی کو، جو انگریز کے خلاف جہاد کے مسئلے میں بوجوہ اہل حدیث کے اکثریتی ذہن سے مختلف رائے رکھتے تھے، خاص کوشش کر کے حکومت سے یہ فیصلہ کروایا کہ اہلحدیث کو اہلحدیث کہا جاتے۔ انہیں وہابی نہ کہا جائے (یہ موضوع الگ ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے) تاہم اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا، کیونکہ مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے مسلکِ وفاداری کو جماعت اہل حدیث نے نہیں اپنایا اور بحیثیت مجموعی وہ تحریکِ جہاد میں شامل، اور اعانتِ مجاہدین میں ہمیشہ سرگرم اور کوشاں رہی۔ اس لیے وہابیت کی اصطلاح میں شرک و بدعات اور رسوماتِ جاہلیہ کے استیصال کے ساتھ ساتھ انگریز کی مخالفت کا مفہوم بھی آخر وقت تک شامل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اہل حدیث کے افراد بھی انگریزی حکومت کی آنکھوں میں ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتے رہے اور ان کی دار و گیر کا سلسلہ بھی جوں کا توں قائم رہا۔ جس طرح قاضی عبدالرحیم مرحوم کے بیان میں یہ صراحت گزر چکی ہے کہ ہر اہل حدیث مسجد اور مدرسے میں معلم، متعلم، مؤذن یا خادم کی صورت میں انگریز کے کارندے جاسوسی کا کام کرتے تھے۔ علاوہ ازیں سید سلیمان ندوی رحمہ کا یہ اعتراف بھی گزر چکا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی زندگی تک جماعت اہلحدیث میں روحِ جہاد کام کرتی رہی ہے۔ اور مولانا رحیم آبادی کی وفات ۱۹۱۸ء میں ہوئی ہے۔ قاضی کورٹ (گوجرانوالہ) کا "بم کیس" ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے جس میں اہل حدیث افراد کو سزائیں دی گئیں۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی امیر المجاہدین، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد علی قصوری، مولانا عبدالرحیم بن مولانا رحیم بخش، عرف مولانا محمد بشیر شہید امیر المجاہدین صوفی محمد عبداللہ رحمہ اور بہت سے

افراد نے اس کے بعد تک جہاد کے مقدس مشن کو زندہ رکھا اور اس راہ کی تمام صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے رہے، جس کی کچھ تفصیل مشاہداتِ کابل و یاغستان" اور " سرگزشتِ مجاہدین" وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے "سرگزشتِ مجاہدین" میں کی گئی یہ صراحت بھی پہلے بیان ہو چکی ہے کہ آخری دور میں اعانت مجاہدین کا بیشتر کام جماعت اہل حدیث کے افراد ہی کرتے رہے ہیں۔

علاوہ ازیں تحریک ریشمی رومال کی جو اصل دستاویزات، جو سرکاری رپورٹوں پر مشتمل ہے۔ "تحریکِ شیخ الہند" کے نام سے چھپی ہیں، اس میں بھی اہلحدیث افراد اور علماء کے نام ملتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ ان دستاویزات میں اہلحدیث حضرات اور علماء کو ہر جگہ "وہابی مولوی" متعصب اور جنونی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے، جب کہ کسی حنفی کو وہابی نہیں کہا گیا (اس کی تفصیل تحریک ریشمی رومال میں آگے آ رہی ہے)

مولانا عبید اللہ سندھی بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس تحریکِ جہاد میں غیر مقلدیت کی آمیزش ہو گئی تھی۔ بلکہ ان کے خیال میں تحریکِ جہاد میں ناکامی کا سبب بھی یہی چیز ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا سندھی کے خیالات پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مولانا سندھی کے نزدیک سید شہید کی تحریک کی ناکامی کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شوکانیت اور وہابیت یا صریح لفظ کہیے کہ غیر مقلدیت کی آمیزش ہو گئی تھی"۔ [1]

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سندھی کی اس رائے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس تحریک کے علمبرداروں میں فقہی جنگ و جدال یا آمین اور رفع یدین کے ذریعے ردِ بدعت یا اتباعِ سنت کا خیال کبھی راہ نہیں پایا۔ سید شہید، مولانا شہید

---

[1] ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۴۴ء، صفحہ ۹۹۔

اور دوسرے وابستگانِ دامن کی تحریر و تقریر، مناظرہ اور خطوط و مکاتیب وغیرہ موجود ہیں۔ ان سے استناد کرنا چاہیئے۔ تحریک کا مقصود عقائد کی صحیح اصلاح، اعمال کی اصلاح، توحید کی اشاعت، باطل کا رد اور رسومِ فاسدہ کا ازالہ اور احکام اسلامی کا اجراء تھا۔ باقی حکایات و روایات آحاد۔ اس باب میں سند کے قابل نہیں۔ . . . البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس تحریک نے اتباع سنت کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس کے اثر سے کچھ لوگوں کو موجودہ کتبِ احادیث کے دفتر میں جو چیز اوّل دہلے میں سنت ثابت ہوتی نظر آئی ہے۔ اس کے قبول کر لینے میں کوئی تقلیدی خیال ان کو باز نہ رکھ سکا۔" لہ

مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ تبصرہ بڑا جچا تُلا اور واقعات کے مطابق ہے بلاشبہ وہابی مجاہدین نے فقہی مسائل کو جنگ و جدال کا ذریعہ نہیں بنایا اور انہوں نے اپنی اصل توجہ اپنے اصل مقصد "جہاد" پر ہی مرکوز رکھی، یہی وجہ ہے کہ انہیں اہلحدیث عوام کے علاوہ دیگر بعض عوامی حلقوں کی تائید بھی حاصل رہی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے۔ کہ چونکہ وہ خود عامل بالحدیث اور تقلیدی جمود سے گریزاں تھے۔ اس لیے وہ جہاں جہاں گئے اور عوام کے جس جس حلقے میں انہیں اثر و نفوذ کا موقع ملا۔ وہاں وہاں توحید و سنت کی مشعلیں فروزاں ہوتی اور تقلید کی جکڑ بندیاں ٹوٹتی چلی گئیں۔ اور تحریکِ جہاد کا یہی پہلو مولانا سندھی وغیرہ کے لیے قلق و اضطراب کا سب سے زیادہ باعث بنا رہا۔ عفراللہ لہ۔

اس لیے مولانا بٹالوی کی ان کوششوں سے کہ انھوں نے وہابی کی بجائے "اہل حدیث" کا لفظ حکومت سے منظور کروایا۔ تحریکِ جہاد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا اور جماعت کے افراد بدستور اس محاذ پہ سرگرم رہے۔ بنا بریں یہ دعویٰ یکسر خلافِ واقعہ ہے کہ مولانا بٹالوی کی کوششوں سے اس جماعت کا رُخ انگریز کی مخالفت کی بجائے وفاداری کی طرف ہوگیا۔

لہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۴۳ء، صفحہ ۹۹۔

چنانچہ مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ گوجرانوالہ اسی سلسلے کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"اہلِ حدیث کی طرف سے انگریز کی حمایت میں اگر کوئی قابلِ ذکر آواز اٹھی تو وہ مولانا محمد حسین صاحب مرحوم بٹالوی کی تھی۔ یقیناً مولانا اس رائے میں اکیلے تھے۔ یہ ان کی شخصی رائے تھی، پورے ملک (متحدہ ہند) میں کوئی قابلِ ذکر اہلحدیث اس نظریئے میں ان کے ساتھ نہ تھا بلکہ عین اس وقت جب کہ مولانا اپنے رسالے میں انگریز کی حمایت فرما رہے تھے، ہندوستان اور پنجاب میں اکابرِ جماعت سید احمد شہید رحمہ کی تحریک کے کامیاب بنانے میں سرگرم عمل تھے۔ کیا کسی غزنوی اور لکھوی خاندان یا صادق پوری اور رحیم آبادی اور قصوری اکابر نے مولانا بٹالوی رحمہ کی کبھی حمایت فرمائی ! اسے جماعتی فعل تصور کرنا واقعات پر ظلم ہے" [1]

اسی طرح یہ بات بھی یکسر غیر صحیح ہے کہ وہابی مجاہدین سے مراد حنفی اور اہلِ حدیث دونوں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہابی سے مراد اہلِ حدیث ہی ہیں نہ کہ کوئی اور بھی۔

بہر حال مقصود اس تفصیل سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ سیدین کی شہادت کے بعد اس تحریکِ جہاد و اصلاح کو جن افراد نے زندہ رکھا اور اس کے لیے جان و مال کی بے بہا قربانیاں پیش کیں۔ وہ صرف اہلحدیث تھے، اور یہ صورتحال تقریباً بیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں تک قائم رہی۔ پھر جب ۱۹۱۹ء اور اس کے بعد "تحریکِ خلافت" ــــ "تحریکِ ترکِ موالات" ــــ "جمعیۃ العلمائے ہند" اور "احرار" وغیرہ جیسی ملی، سیاسی اور قومی تحریکیں برپا ہوئیں، تو ان میں البتہ علمائے دیوبند نظر آتے ہیں لیکن اس طرح کہ علمائے اہلحدیث بھی ان میں سے ہر تحریک میں بزرگانِ دیوبند کے قدم بقدم شریک رہے۔ چنانچہ مذکورہ تحریکوں اور تنظیموں کی رپورٹیں ملاحظہ فرمائی جائیں، ان میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا

---

[1] ماہنامہ "رحیق" لاہور، صفحہ ۱۰۵-۱۰۶۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء

حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عبیداللہ احرار اور دیگر بہت سے علماء اور افرادِ جماعت کے نام ان میں ضرور ملیں گے۔

اسی طرح قصوری خاندان کے اکابر مولانا عبدالقادر قصوریؒ اور ان کے صاحبزادگان والا تبار مولانا محمد علی قصوریؒ، مولانا محی الدین احمد قصوریؒ وغیرہم کی سیاسی و ملی خدمات کو کون فراموش کر سکتا ہے؟ ان اکابر نے ہر اہم تحریک میں جان و مال کی بیش قیمت قربانیاں دیں ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تحریکِ جہاد اور علمائے احناف

اس تفصیل سے اس بات کی بھی از خود واضح تردید ہو جاتی ہے کہ تحریکِ جہاد کی قیادت علمائے احناف نے بھی کسی مرحلے پر کی ہے۔ واقعہ یہ ہے، کہ سیّد احمد شہیدؒ کی زندگی میں اگرچہ حنفی اور اہلحدیث دونوں اس تحریک میں شامل نظر آتے ہیں۔ (یہ حنفی دیوبندی حنفی البتہ نہ تھے بلکہ ولی اللٰہی حنفی تھے۔ جن میں تقلیدی جمود بہت کم تھا)، لیکن بعد میں اس تحریک کی ساری قیادت اُن حضرات نے کی ہے۔ جو تقلید کی جکڑ بندیوں سے نہ صرف آزاد تھے۔ بلکہ ان کی تبلیغ سے تقلید کے بندھن ٹوٹے ہیں۔ اور عمل بالحدیث کے جذبے کو فروغ ملا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جتنی بھی پکڑ دھکڑ، دارو گیر، ضبطیٔ جائیداد اور دیگر سزائیں ہوئی ہیں۔ اُن میں بھی خاندانِ صادق پوری سرِ فہرست ہے۔ اس خاندان نے اس راہ میں جس عزیمت و استقامت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جس جس ابتلاء و آزمائش سے وہ دوچار ہوا ہے، اُسے زبان و بیان کے قالب میں ڈھالنا ناممکن ہے۔ (اس کی ضروری تفصیل مولانا مسعود عالم ندویؒ کی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔) اس پوری رودادِ الم اور سرگزشتِ جہاد میں کہیں حنفی علماء کا نام نظر نہیں آتا۔ البتہ صادق پوری خاندان کے مردانِ جفاکش نے اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ خاندان حنفی زہاد کو خطاب کر کے بجا طور پر کہہ سکتا ہے۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
جو چند ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

حنفی اہلِ قلم کی تاریخ سازی

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ کہ آج کل کے حنفی اہلِ قلم جنگ آزادی کا ہیرو علمائے احناف کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہیرو ہونا تو بہت بڑی بات ہے، انہوں نے اس میں سرے سے حصہ ہی نہیں لیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی بابت تو اختلاف کی گنجائش ہے کہ وہ بھی تحریکِ جہاد کا حصہ تھی یا نہیں۔؟ کیونکہ اس میں ہر قسم کا عنصر شامل تھا، لیکن اس سے قبل اور اس کے بعد جو تحریکِ جہاد جاری رہی ہے۔ وہ خالصتہً ایک دینی تحریک تھی۔ جس نے انگریزوں کا ناک میں دم کیے رکھا اور یہی تحریکِ جہاد آزادئ ہند کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس تحریکِ جہاد میں ۱۸۵۷ء کے بعد علمائے احناف کب اور کہاں شریک رہے؟ انہوں نے کیا کارنامے سر انجام دیئے اور کس کس ابتلاء و آزمائش سے دو چار ہوئے؟ کون ہے جو اس کی نشاندہی کر سکے؟ اس کا ثبوت مہیّا کر سکے؟

جنگِ شاملی کا قصہ

لے دے کے ایک واقعہ ہے جنگِ شاملی کا جس میں بانیانِ مدرسہ دیوبند کی شمولیت اور اس میں معرکہ ہائے رستا خیز انجام دینے کا خوب خوب پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس واقعے کی بنیاد پر علمائے دیوبند کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ہیرو ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن اوّل تو اس واقعے کی وہ تفصیلات ہی محلِ نظر ہیں جو آج کل بیان کی جاتی ہیں۔ اس واقعے میں بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن شہید اور ان کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے حصہ لیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے اوّلین سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے "تذکرۃ الرشید" میں اس واقعے کو اور اس کے بعد کی تفصیلات کو جس طرح بیان کیا ہے۔ اس سے قطعاً اس بات کا ثبوت مہیّا نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا کوئی حصہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاملی کا یہ قصہ دراصل فسادیوں "تذکرۃ الرشید" کے الفاظ میں یعنی ۱۸۵۷ء کے

سیاسی ہنگاموں میں حصہ لینے والوں) کے خلاف ایک معرکہ کارزار تھا۔ جس میں حافظ ضامن "دو فسادیوں" کی گولی سے شہید ہو گئے۔ اس واقعے کی حکام کو غلط انداز سے اطلاع دی گئی۔ جس کی بنا پر مولانا نانوتوی وغیرہ کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔ مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی تو روپوش ہو گئے اور حاجی امداد اللہ مکیؒ صاحب چھپ چھپا کے مکہ ہجرت فرما گئے۔ کچھ عرصے بعد مولانا گنگوہیؒ پر مقدمہ چلا بھی تو انہوں نے عدالت میں بھی یہی بیان دیا کہ "ہم فسادوں سے کوسوں دور ہیں"۔ گویا عدالت میں بھی انہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لینے سے انکار ہی کیا۔ عدالت کی نظر میں بھی فی الواقع وہ اس جرم جہاد کے "مجرم" نہیں پائے گئے۔ اس لیے انہیں بری کر دیا گیا۔

مؤلف "تذکرۃ الرشید" کی بیان کردہ مذکورہ بالا تفصیلات کے متعلق آج کل دیوبندی

■ حناف یہ کہتے ہیں کہ سوانح نگار نے انگریزوں کے ڈر کی وجہ سے صورت واقعہ کو بالکل مختلف انداز میں پیش کیا ہے، واقعہ تھا اصل میں انگریزوں کے خلاف لیکن مصلحۃً اسے بنا دیا انگریزوں کی حمایت میں تاکہ علمائے دیوبند انگریز کی دار و گیر سے محفوظ رہیں اور ان کے متعلق یہ معلوم نہ ہو سکے کہ انہوں نے کسی موقع پر انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا۔ لیکن اول تو ایک عقیدت مند سوانح نگار سے یہ توقع نہیں کہ وہ کسی واقعے کو اس طرح مسخ کر دے کہ اس کی صورت ہی بدل جائے۔ دوسرے جب دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ علمائے دیوبند تحریک جہاد اور جنگ آزادی میں پیش پیش اور بڑے نمایاں رہے ہیں۔ تو اس پر پردہ ڈالنے کا کیا مقصد؟ اس کا تو صاف مطلب یہی ہے کہ چلو مذکورہ بزرگوں کا جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں شریک ہونا ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بعد علمائے دیوبند نے اس محاذ پر خاموشی اختیار کر لی۔ تب ہی تو مذکورہ واقعۂ شاملی پر پردہ ڈالنا ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اور انگریز یہی سمجھتا کہ دیوبند کے علماء کا یہ طبقہ جس طرح آج کل سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ تعلیم و تدریس میں مشغول ہے، اس کے اولین بزرگ بھی اسی طرح رہے ہوں گے۔ اگر مؤلف "تذکرۃ الرشید" کے بیان کو مصلحت پر محمول کیا جائے تو اس سے یقیناً اپنے آپ یہ بات پایۂ ثبوت

کو پہنچ جاتی ہے کہ صرف ایک موقعے پر وہ بھی محدود پیمانے پر ان کے چند بزرگوں نے ایک جہادی مہم میں حصّہ لیا تھا۔ اور بس، نہ اس سے پہلے کبھی انہوں نے اس محاذ پر کوئی سرگرمی دکھائی اور نہ اس کے بعد ایسی مہمات میں کوئی حصّہ لیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی تصریحات

یہ تو اس صورت میں ہے۔ جب واقعۂ شاملی کی وہ نوعیت صحیح تسلیم کر لی جائے جو آج کل کے احناف باور کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاملی کے اس قصّے کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک اہم واقعہ جہاد اور تحریک مجاہدین کا ایک حصّہ ثابت کرنا ہی ناممکن ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، جنہوں نے تین ضخیم حصّوں میں مولانا نانوتوی کی سوانح۔ سوانح قاسمی۔ لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے صاف اعتراف کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مولانا نانوتوی اور ان کے دینی وعلمی رفقاء کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ انہوں نے اس واقعے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے بعض اقتباسات درج ہیں۔

"آج کل فضل وکمال، بڑائی اور بزرگی کا سب سے بڑا معیار یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ سیاسی کاروبار میں سب سے زیادہ نمایاں حصّہ جس نے لیا، وہی سب سے بڑا آدمی ہے اور دوسرے میدانوں میں خواہ کچھ ہی حال ہو، کسی مقام کا مالک ہو، لیکن سیاست کے میدان کا جو اپنے آپ کو کھلاڑی ثابت نہ کر سکا، وہ کچھ نہیں ہے۔ اسی عام سطحی معیار کو دیکھ کر بے دھڑک یہ مان لینا کہ غدر کے ہنگامے میں سیدنا الامام الکبیر (مولانا نانوتوی) نے تو اسی طرح حصّہ لیا تھا، جیسے اس ملک کے عام باشندے اس کی آگ میں کود پڑے تھے۔ سیدنا الامام الکبیرؒ کی شان ہی کے مطابق اس قسم کا عاجلانہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے اور نہ واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔"

(سوانح قاسمی۔ ج ۲، ص ۸۹)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

"اتنی بات بہرحال یقینی ہے اور ان ناقابلِ انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا اقتضاء ہے۔ کہ مالیخولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں کہ غدر کے ہنگامے کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ" مولانا فسادوں سے کوسوں دور رہتے" (حوالہ مذکور۔ ص ۱۰۹)

واقعہ شاملی کی اصل نوعیّت

جب واقعہ یہ ہے تو پھر شاملی کے واقعہ کی اصل نوعیت کیا ہے؟ اس کی وضاحت مولانا گیلانی نے اس طرح کی ہے کہ تھانہ بھون کے بعض افراد کو مقامی انگریزی حکام نے غلط مخبری کی وجہ سے پھانسی پر چڑھا دیا تھا، ان میں قاضی خاندان کا بھی ایک معزز فرد تھا۔ جس کا بہت زیادہ صدمہ ان کے بڑے بھائی کو ہوا اور وہ زندگی سے بیزار ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مقامی لوگوں نے اس بنا پر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ کہ جو لوگ ناحق (غلط مخبری کی بنا پر) مارے گئے ہیں اور یوں ان کے خاندان اور وارثین مظلوم ہیں، ان مظلوموں کی مدد کرنا اور ظالموں کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے مقتولین کا انتقام لینے کے لیے مقامی انگریزوں سے لڑنے کا پروگرام بنایا۔ جس میں ان حضرات (علمائے دیوبند) نے بھی حصہ لیا۔ یہ گویا مولانا گیلانی کے الفاظ میں اس معرکہ میں ان کی شرکت مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ۔ الحدیث۔ (جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے، اور جو اپنی آبرو بچاتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے) کی تعمیلی شکل تھی۔ اس جنگ میں چونکہ کئی انگریز مارے گئے اس لیے بعد میں مولانا نانوتوی وغیرہ کو متعدد مرتبہ چھاپے مار مار کر گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن مولانا نانوتوی ہر مرتبہ فرق

عادت اور معجزانہ طور پر بچ جاتے رہتے تاہم یہ اندیشہ ناک صورت حال ۱۸۶۱ء تک رہی اور اس کے بعد انگریزی حکومت نے ان کو خطرناک سمجھنا ترک کر دیا۔ واقعہ کی یہ وہ مختصر تفصیل ہے جو مولانا گیلانی نے اپنے طرزِ نگارش کے مطابق کافی تفصیل سے لکھی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں۔

"بہرحال ابتدائی اسباب کے لحاظ سے اگرچہ تھانہ بھون کی یہ جہادی تحریک جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، انتصار اور انتقام کی ایک مقامی تحریک تھی۔ حکومت نے ملک کے باشندوں سے جو آئینی معاہدہ کیا تھا اس معاہدے کو توڑ کر وہ عہد شکنی اور غدر کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسی چیز نے اس علاقے کے باشندوں کو انتصار و انتقام کے قرآنی حکم کی تعمیل پر آمادہ کیا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے بھی اس تحریک کا دائرہ جیسا کہ خدا کی مشیت تھی۔ زیادہ وسعت حاصل نہ کر سکا۔" (سوانح قاسمی۔ ج ۲، ص ۱۲۹)

علمائے احناف نے انگریزوں کے خلاف جدّوجہد میں حصّہ کیوں نہیں لیا؟

اس تفصیل سے واضح ہے کہ انگریزوں کے خلاف جو تحریک چل رہی تھی۔ علمائے احناف اس میں شریک نہیں تھے۔ شاملی کی "جنگ" کا بھی کوئی تعلق اس تحریکِ جہاد سے نہ تھا۔ وہ ظالم حاکم اور مظلوم رعایا کے درمیان ایک محدود سی جھڑپ تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ علمائے احناف تحریکِ جہاد سے الگ کیوں رہے؟ اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ کیوں نہیں لیا؟ تو اس کی وجہ تو وہی بتلا سکتے ہیں۔ تاہم ایک وجہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی سوانح قاسمی میں ذکر کی ہے وہ ہم نقل کیے دیتے ہیں۔ مناظر احسن گیلانی مرحوم نے یہ بات مختلف موقعوں پر خود نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ حیدرآباد دکن کی زبان سے سنی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"انگریزوں کے مقابلے میں جو لوگ لڑ رہے تھے۔ ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمہ اللہ بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چوہدری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے، کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ خضرؑ کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔ نواب صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے۔ کہ غدر کے بعد جب گنج مرادآباد کی ویران مسجد میں حضرت مولانا جا کر مقیم ہوئے تو اتفاقاً اسی راستے سے جس کے کنارے مسجد ہے۔ کسی وجہ سے انگریزی فوج گزر رہی تھی۔ مولانا مسجد سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس سے جو باگ ڈور کھونٹے وغیرہ گھوڑے کا لیے ہوئے تھا۔ اس سے باتیں کر کے پھر مسجد واپس آ گئے۔ اب یاد نہیں رہا کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرمانے لگے کہ سائیس، جس سے میں نے گفتگو کی، یہ خضرؑ تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے؟ تو جواب میں کہا کہ حکم یہی ہوا ہے۔" (سوانح قاسمی۔ ج ۲، ص ۱۰۳)

اپنے بزرگوں کے مکاشفے اور مشاہدہ امورِ غیبیہ پر ایمان لانے میں دیوبندی حنفی، بریلوی حنفیوں سے بھی چار قدم آگے ہی ہیں۔ اس لیے جب ان کے بزرگ کو روحانی کشف کے ذریعے حضرت خضرؑ کا نہ صرف انگریزوں کی حمایت و رفاقت کا بلکہ حضرت خضرؑ کے انگریزی فوج کے ادنیٰ خادم (سائیس) ہونے کا علم ہو گیا، تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انگریزی فوج کو نصرتِ ایزدی اور تائیدِ غیبی حاصل تھی۔ اب ایسے مؤیَّد مِن اللہ (انگریزوں) سے بھلا علمائے احناف کیوں برسرِ پیکار ہوتے؟ اور ان کے خلاف جدّوجہد کر کے کیوں غضبِ الٰہی کا مورد بنتے؟

۱۷

انگریز گورنر کے خصوصی نمائندے کی شہادت

بہرحال قصہ یہ ہو یا کچھ اور اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ بحیثیت مجموعی علمائے احناف تحریکِ جہاد سے الگ رہے ہیں اور اس میں انھوں نے حصّہ نہیں لیا۔

بزرگانِ دیو بند کی تحریکِ جہاد سے ناوابستگی کی تائید اُس خاص نمائندے (مسٹر پامر) کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس کو ۱۸۷۵ء میں انگریز نے دارالعلوم دیوبند کے معائنے کے لیے بھیجا تھا، اس نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی تحریر کیا تھا۔

"یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ موافقِ سرکار و مُمِد و مُعاونِ سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن ہیں کہ ایک دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔" [۱]

علاوہ ازیں ڈبلیو ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس کتاب کا خاص موضوع ہی یہ تھا کہ اُن افراد اور جماعتوں کی نشاندہی کی جائے جو انگریزی حکومت کی مخالف ہیں اور انگریزی حکومت سے جہاد کو ضروری سمجھتی ہیں۔ اس ضمن میں ہنٹر بار بار وہابی علماءٔ اہل صادق پور اور ان کے ہمنواؤں کو انگریزی حکومت کا دشمن لکھتا ہے، ان کی سرگرمیوں کی وضاحت کرتا ہے، انگریزی فوج سے ان کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل بیان کرتا ہے اور اس راہ میں ان کو پیش آنے والی مصیبتوں، تکلیفوں اور مقدمات کا ذکر کر کے ان کے بے مثال عزم و استقامت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ لیکن اس انگریز مُبصر نے کہیں بھی اکابر دیوبند کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر اکابر دیوبند نے کسی درجے میں بھی انگریز کی مخالفت کی ہوتی اور تحریکِ جہاد سے تعاون کیا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ ہنٹر کی نظر سے ان کا کردار مخفی رہ جاتا اور ان کے ذکر سے کتاب خالی رہتی۔ علاوہ ازیں مولانا محمد میاں مصنّف "علمائے ہند کا شاندار ماضی" بھی، باوجود اس بات کے کہ انھوں نے واقعۂ شاملی کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے اور اسے انگریز کے خلاف تحریکِ جہاد کا ایک حصہ باور کرانے کی سعی کی ہے، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ

---

[۱] مولانا محمد احسن نانوتوی، مؤلفہ پروفیسر محمد ایوب قادری، صفحہ ۱۱

"اس موقع پر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیرانی ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ صفحاتِ تاریخ پر مالا گڈھ اور فرخ نگر جیسے گمنام مقامات کے نام موجود ہیں، لیکن اس علاقے (یعنی ضلع مظفر نگر و سہارن پور، جس میں دیوبند واقع ہے) اور اس کے مجاہدین کا کوئی تذکرہ نہیں" [1]

یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا اظہار بے ساختہ ان کی زبانِ قلم سے ہو گیا ہے ورنہ اس اعتراف کے بعد انھوں نے اس علاقے کو تحریکِ جہاد میں شریک گردا ننے کے لیے جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ سب تاریخ سازی ہے جسے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے "مالیخولیا" سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، جلد چہارم، ص ۲۹۹، طبع لاہور

تحریک ریشمی رومال

تھوڑی دیر کے لیے اگر مان لیا جائے کہ واقعۂ شاملی کی نوعیت وہی ہے، جو آج کل کے دیوبندی اہلِ قلم باور کرارہے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعۂ شاملی کے ایک محدود سے واقعے کے بعد پھران بزرگانِ دیوبند نے اس تحریکِ جہاد کو کس طرح زندہ رکھا؟ اور اس راہ کی وہ کون سی صعوبتیں ہیں جو اہلِ دیوبند کو سہنی پڑیں؟ اور وہ کون سی سرگرمیاں ہیں جن سے معلوم ہو کہ فی الواقع مذکورہ بزرگانِ دیوبند نے جہاد کے اِس عَلم کو اُسی طرح تھامے رکھا جس کا مظاہرہ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں کیا تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ تمام تر تاریخ سازی کے باوجود دیوبندی اہلِ قلم اس کی تفصیلات مہیا کرنے سے عاجز ہیں [۱] وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا

تاہم نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) گزر جانے کے بعد "ریشمی رومال کی تحریک" کے عنوان سے ایک اور تحریک کا سُراغ ملتا ہے جو ۱۹۱۴ء کے بعد شیخ الہند نے شروع کی تھی اور جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر آٹھ افراد گرفتار ہوئے تھے اور تقریباً چار سال کے قریب مالٹا میں محبوس رہے، جس کی سرگزشت مولانا مدنی مرحوم نے "اسیر مالٹا" نامی کتاب میں درج کی ہے۔

---

[۱] البتہ اس کے برعکس ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت سے ان کی وفاداری کا ثبوت مسٹر پامر کے اُس بیان سے ملتا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قائم کردہ پارٹی جمعیۃ الانصار (۱۹۱۱ء) کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں منظور شدہ تجاویز میں، ایک تجویز یہ بھی ملتی ہے۔

"ایسے چھوٹے چھوٹے رسائل بکثرت مفت شائع کرنا جن میں عقائد اسلام کی تعلیم، فرقہ آریہ کے جوابات اور وفاداریٔ گورنمنٹ کی ہدایات ہوں۔" (تذکرۂ شیخ الہند" مؤلفہ مفتی عزیز الرحمن صاحب، ص ۱۷۲۔ ادارہ مدنی دارالتالیف، بجنور، ہند)

اس تحریک کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلاف سلطنتِ عثمانیہ وغیرہ سے امداد حاصل کرنا تھا تاکہ یہاں سے انگریز کو دیس نکالا دیا جا سکے۔ اس سلسلے میں مولانا محمود حسن مرحوم نے ریشمی رومالوں میں کچھ ضروری ہدایات دے کر بعض افراد کو ترکی، حجاز وغیرہ بھیجا تھا کہ مخبری کی وجہ سے راز فاش ہو گیا اور وہ ریشمی رومال حکومت کے ہاتھ لگ گئے۔ اور مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر متعلقہ افراد گرفتار کر لیے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کی اصل حقیقت ابھی تک پردۂ خفا میں ہے اس کی صحیح صحیح نوعیت سے آگاہی اب تقریباً ناممکن سی بات ہے۔ تاہم اب اُن اصل دستاویزات کا اُردو ترجمہ شائع ہو گیا ہے جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھیں۔ اور یہ سارا مواد "تحریکِ شیخ الہند" نامی کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے جو لاہور میں طبع ہوئی ہے۔ ہم اس کتاب کی روشنی میں اپنے مطالعے کے نتائج ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ یہ تحریک بھی چند افراد کی سوچ بچار کا نتیجہ تھی جس کا اصل بانی انگریزی دستاویزات میں تو مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو بتلایا گیا ہے اور شیخ الہند کو ان سے متاثر اور آلۂ کار۔ لیکن دیوبندی اہلِ قلم اس کا بانی شیخ الہند کو ہی قرار دیتے ہیں۔ بہر حال تحریک کا بانی کوئی بھی ہو۔ اسے پورے علمائے دیوبند کی تائید حاصل نہیں تھی۔ اسی لیے اس میں شیخ الہند، مولانا مدنی، مولانا عزیز گل اور مولانا سندھی کے علاوہ دیگر اکابرِ دیوبند کا ذکر نہیں ملتا۔

۲۔ اس تحریک سے قبل مدرسہ دیوبند میں انگریز کے خلاف کسی تحریک کا ثبوت نہیں ملتا اس کی تائید "تحریکِ شیخ الہند" کی حسبِ ذیل عبارات سے ہوتی ہے۔

"مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی بانیانِ دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد و نصب العین بھی وہی تھا جس کے لیے کارفرمایانِ دیوبند میں سے صرف حضرت شیخ الہند سرگرمِ عمل ہوئے۔ اس طریقے اور شیوہ کے مطابق

"تحریکِ شیخ الہند" ص۱۰۱ مکتبہ رشیدیہ، لاہور

جلد حسب مراد نتیجے برآمد ہونے کی توقع نہ رکھی جا سکتی تھی۔"[1]

اس میں صاف صراحت موجود ہے کہ صرف شیخ الہند ہی اس محاذ پر سرگرم عمل ہوئے اسی لیے حسب مراد نتیجہ برآمد ہونے کی توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ علاوہ ازیں کتاب میں مزید صراحت موجود ہے کہ :۔

"اس تحریک کے زمانے میں مہتمم صاحبان نے حکومت کے ذمہ داروں سے تعلق رکھا حتیٰ کہ گورنر یو پی کو دار العلوم دیوبند میں مدعو کیا اس کو ایڈریس بھی پیش کیا اور اس تعلق کا نتیجہ تھا کہ حافظ صاحب (حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند) کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔"[2]

گویا تحریک کے زمانے میں بھی دیگر اکابر دیوبند تحریک سے یکسر مختلف راستے پر یعنی انگریزی حکومت کی وفاداری کی پالیسی پر گامزن تھے۔ اس کا شکوہ ایک مکتوب میں بھی کیا گیا ہے جو تحریک کے ایک رکن نے مولانا محمود حسن کے نام تحریر کیا تھا۔

"مالکانِ مدرسہ سرکار کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، نمائش کے دربار میں شرکت کا فخر بھی نصیب ہونے لگا۔"[3]

دستاویزات میں مدرسہ (دیوبند) اور اس کے اُس وقت کے مہتمم کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

"مدرسہ، یہ دیوبند کے عربی مدرسے کی طرف اشارہ ہے جو دیوبند ضلع سہارنپور میں قائم ہے...... مدرسے کے پرنسپل شمس العلماء مولوی حافظ محمد احمد ہیں جو اس ادارے کے مرحوم بانی (مولانا محمد قاسم نانوتوی) کے فرزند ہیں، وہ وفادار اور شریف آدمی ہیں۔"[4]

۲۔ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے "نقش حیات" میں مذکورہ حقائق کی یہ تاویل کی ہے کہ انگریزی حکومت سے ارباب مدرسہ کی یہ وفاداری مصلحت و حکمت پر مبنی تھی تاکہ حکومت مدرسے کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ لیکن یہ توجیہہ اول تو واقعات کے مطابق نہیں۔ واقعہ یہی ہے

[1-4] "تحریک شیخ الہند" صفحہ ۱۰۸، ۱۵۵، ۳۲۵، ۲۸۳

کہ اکابر دیو بند کی اکثریت تعلیم و تدریس سے منسلک رہی ہے اور انگریز کے خلاف سرگرم جماعتوں اور گروہوں سے اس نے کوئی تعلق نہیں رکھا ہے۔ اس کی تائید تحریکِ شیخ الہند کی درج ذیل دستاویزات سے بھی ہوتی ہے۔

"مدرسہ دارالعلوم (دیو بند) میں سرکشی کا آغاز عبیداللہ سے ہوتا ہے، یہ شخص نومسلم سکھ ہے، اس نے ۱۸۸۹ء کے درمیان مدرسے میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۹ء میں استاذ بن کر مدرسے میں غداری کے جذبات پیدا کرنے کے ارادے سے شامل ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں غیر ملکی بائیکاٹ کرنے کی تلقین پر اس کو برطرف کر دیا گیا۔ لیکن اس دوران اس نے صدر مدرس محمود حسن کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیا۔"[1]

مولانا حسین احمد مدنی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کا مدرسہ دیو بند سے اخراج کا

"اصل سبب وہ امر ہے جس کی بنا پر مسٹن گورنر یو پی دیو بند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔"[2]

گویا مدرسے کی انگریزی حکومت سے وفاداری کے اثبات کے لیے مولانا سندھی مرحوم کو دارالعلوم کی مسندِ تدریس سے علیحدہ کیا گیا، کیونکہ انھوں نے ہی وہاں آ کر سب سے پہلے حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات پھیلانے شروع کیے تھے۔ چنانچہ "تحریکِ شیخ الہند" میں ہے کہ اسی قسم کی قابلِ اعتراض باتوں کی وجہ سے مدرسہ کے سربراہ نے موقعہ نکال کر مولوی عبیداللہ کو طلب کیا اور اس بارے میں سخت سرزنش کی۔[3]

مدرسہ دیو بند کی سیاست سے لاتعلقی کی مزید وضاحت ملاحظہ ہو۔

"دیو بند کا مدرسہ شمس العلماء حافظ محمد احمد پسر مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ کے محتاط انتظام میں ماضی کے بہت سے برسوں سے سیاست سے بالکل پاک و صاف

---

[1] "تحریکِ شیخ الہند" صفحہ ۲۰۸

[2] "نقشِ حیات" جلد دوم، صفحہ ۲۴۰ - حاشیہ

[3] "تحریکِ شیخ الہند" صفحہ ۲۶۱ - ۲۶۲

رہا تھا اور اس کے مُدرّسوں اور متعلموں نے جدید سیاست یا اُمور خارجہ میں نہایت خفیف دلچسپی لی تھی یا مطلق دلچسپی نہ لی تھی، عبیداللہ کی آمد سے اور اس کے اثر سے مدرسے کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔" [۱]

ان حوالوں سے یہ بات واضح ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں انگریزی حکومت کے خلاف فضا پیدا کرنے کی کوشش کی، ورنہ اس سے قبل دارالعلوم سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھا چنانچہ ارباب مدرسہ کو انہیں مدرسے سے خارج کرنا پڑا تا کہ مدرسے کی وفاداری مجروح نہ ہو۔

۴۔ یہ تحریک خالص اسلامی حکومت کے قیام کے لیے نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد انگریزی حکومت کی بجائے ایک قومی حکومت کا قیام تھا، یہی وجہ ہے کہ اس میں سکھ اور انقلابی ہندو بھی شامل تھے [۲] جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک بالکل الگ تحریک ہے جو اُس تحریکِ جہاد سے یکسر مختلف ہے جس کا مقصد خالص اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تحریک کے بانیوں نے تحریکِ جہاد میں سرگرم مجاہدین کا تعاون بھی حاصل کیا اور اُن مجاہدین نے بھی اس تحریک سے اس لیے تعاون کیا کہ یہ بھی بہرحال انگریز کے خلاف ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کا جتنا کچھ چرچا ہوا اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ ملک میں تقریباً پون صدی سے وہابیوں کی تحریکِ جہاد انگریز کے خلاف جاری تھی، اسی فضا اور جذبے نے اس تحریکِ ریشمی رومال کو بھی فروغ دیا اور اس کے بانیوں نے بھی اس سے پورا فائدہ اٹھایا، ورنہ صرف دیوبند کے حلقے اور مدرسہ دیوبند کے وابستگان سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس تحریک کے لیے کچھ زیادہ سرگرمی دکھا سکیں گے۔ چنانچہ دستاویزات میں مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کی اسکیم کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

"اس نے اپنی سازشوں میں وہابی تحریک کی باعمل مشینری مولوی طبقہ کا اسلامی جوش وغیرہ اور اتحادِ اسلامی کے حامیوں کی سیاسی توانائی اور تلمی کو یکجا کر دیا تھا۔" [۳]

---

[۱] "تحریکِ شیخ الہند"، صفحہ ۲۶۲۔

[۲] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "نقشِ حیات" جلد دوم، ص ۲۲۸ - ۲۴۰۔

[۳] "تحریکِ شیخ الہند" صفحہ ۲۳۹۔

۵۔ اس تحریک میں وہابی مجاہدین یعنی علمائے اہلِ حدیث بھی پوری طرح شریک تھے، جس طرح کہ دستاویزات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ چنانچہ حسبِ ذیل اہلِ حدیث حضرات کے نام اس تحریک میں ملتے ہیں۔

۱۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔ ان کے متعلق دستاویزات میں کہا گیا ہے "مشہور اور نہایت بااثر اور متعصب وہابی مبلغ ہندوستان میں سفر کرتا رہتا ہے اور وہابیوں کے جلسوں میں دوسرے فرقوں سے مناظروں کے دوران نہایت پُرجوش تقریریں بھی کرتا ہے۔۔۔۔ ظفر علی کا کٹر حامی اور ثناء اللہ امرتسری کا ساتھی اور مولوی عبدالرحیم عرف بشیر۔۔۔۔ کا ساتھی ہے۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور کانپور کی مسجد کے واقعے پر اس نے سیالکوٹ میں کافی بے چینی اور شورش پھیلادی تھی۔"

۲۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (مؤلف حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان)

۳۔ مولوی عبدالحق پسر مولوی محمد غوث (لاہور) دستاویزات میں کہا گیا ہے کہ یہ مولوی عبدالرحیم عرف مولوی بشیر کا برادر نسبتی اور کٹر وہابی ہے۔

۴۔ مولانا عبدالکریم نائب رئیس المجاہدین۔

۵۔ عبدالخالق پسر سردار بہادر محمد امین خاں ساکن موضع عظیم آباد۔

۶۔ حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری۔ انہیں دستاویزات میں "مشہور وہابی مولوی" کہا گیا ہے۔

۷۔ عبداللہ شیخ (سیالکوٹ) انہیں مولوی عبدالرحیم عرف مولوی بشیر اور مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی کا قریبی ساتھی بتلایا گیا ہے۔

۸-۹۔ عبداللطیف اور عبدالمجید۔ ان دونوں کو جہادی پارٹی کا رکن بتلایا گیا ہے۔

۱۰۔ مولانا عبدالقادر قصوری (والد مولانا محمد علی قصوری)

۱۱۔ مولانا سید عبدالسلام فاروقی (مشہور اہلحدیث فاروقی پریس دہلی کے مالک)

۱۲۔ مولانا عبدالرحیم (شہید) عرف مولوی محمد بشیر عرف محمد نذیر پسر مولوی رحیم بخش، ساتق امام مسجد چینیاں والی۔ لاہور۔ ان کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ "وہابیوں کی کتابوں کا بیوپاری، انتہائی متعصب اور پُرجوش۔ جہادی تحریک کا بڑا سرگرم ممبر ہے۔"

۱۳- مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے، "یہ بہار و اڑلیسہ کا ایک ممتاز وہابی، اسی گھنبے کا ایک فرد معلوم ہوتا ہے جس سے اس کے پیشوا احمداللہ کا تعلق ہے۔ جس کو ۱۸۶۵ء میں وہابیوں کے مقدمات میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔"

۱۴- مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی (امیر المجاہدین) ان کے متعلق کہا گیا ہے "وہابی مولوی، انتہائی متعصب ہے اور اس صوبے کے جہادی تحریک کا ایک خطرناک لیڈر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر اُس شخص میں جہاد کی رُوح پھونک دیتا تھا جو اُس سے ملتا تھا اور حافظ عبدالمنان کے شاگردوں کو منحرف کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا جو وزیرآباد کی ایک مسجد میں مذہبی درس دیا کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۱۵- مولانا محی الدین قصوری عرف برکت علی بی اے، پسر مولانا عبدالقادر قصوری (برادر مولانا محمد علی قصوری)

۱۶- مولانا محمد علی قصوری، انہیں سازش کا سرگرم رکن کہا گیا ہے۔

۱۷- محمد اسلم، قصہ خوانی بازار پشاور کا ایک عطار اور سرحد پار مولوی عبدالرحیم عرف بشیر، فضل محمود اور دوسرے جہادیوں کا شریک کار۔

۱۸- محمد الٰہی (برادر مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی) انہیں دستاویزات میں "احمدی" یعنی مرزائی بتلایا گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ اہل حدیث خاندان کے اہل حدیث فرد تھے۔

۱۹- نذیر احمد کاتب، ان کے متعلق کہا گیا ہے "یہ حافظ عبدالمنان کا شاگرد ہے جو وزیرآباد کا مشہور وہابی مولوی ہے۔ اسی کے ذریعے اُس کا تعارف مولوی فضل الٰہی خرادی (وزیرآبادی) سے ہوا، جس نے جہاد کا جذبہ اُس کے اندر بھر دیا۔ بعد میں وہ وہابی بن گیا۔"

۲۰- رشید اللہ پیر جھنڈے والا، مشہور سندھی پیر ساکن موضع گوٹھ پیر جھنڈا تحصیل ہالا۔ ضلع حیدرآباد۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے "یہ بہت متعصب اور جنونی ہے۔ ۔ ۔ پیر رشید اللہ کٹر وہابی کہا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۲۱- مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ ان کے متعلق دستاویزات میں کہا گیا ہے "انجمن اہلحدیث پنجاب کا صدر ہے۔ ہندوستان میں شاید سب سے ممتاز وہابی ہے۔"

۲۲- مولوی ولی محمد فتوحی والا، عرف مولوی موسیٰ - ان کے متعلق کہا گیا ہے: "نہایت متعصب وہابی مولوی ہے جو سرگرمی سے جہاد کے نظریے کی تبلیغ کرنے اور اس مقصد کے لیے زر، پیہ اور آدمی جمع کرنے میں مصروف ہے۔"

۲۳- نواب ضمیر الدین احمد - ان کے متعلق کہا گیا ہے: "شاید یہی نواب ضمیر الدین احمد وہابی مولوی ہے جو دلی میں ضمیر مرزا کے نام سے مشہور ہے۔ وہ نواب لوہارو کا بھائی ہے۔ ۱۹۱۶ء تک وہ اہلحدیث کانفرنس کے صدر رہے۔ جب کہ خرابیٔ صحت کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔"[1]

● ناموں کی اس تفصیل سے واضح ہے کہ ریشمی رومال کی اس تحریک میں اہلحدیث حضرات بھی برابر کے شریک رہے ہیں، اس لیے اس کو خالص دیوبندی تحریک باور کرانا بھی غلط ہے، جس طرح کہ دیوبندی اہلِ قلم کا شیوہ چلا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ مولانا حسین احمد مدنی نے بھی جن معروف شرکائے تحریک کا مختصر تعارف اپنی خود نوشت سوانح حیات "نقشِ حیات" میں کرایا ہے، ان میں مذکورہ اہلِ حدیث حضرات میں سے کسی کا نام ذکر نہیں کیا، صرف اپنے ہی حلقے کے افراد کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس اصل دستاویزات کی اشاعت کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ اس تحریک میں بھی علمائے اہلحدیث پوری طرح شامل تھے بلکہ ایسے خلوص اور استقامت سے شریک رہے کہ کسی موقعے پر بھی تحریک کا راز افشا نہ کیا، جب کہ کئی دیوبندی حضرات عزم و استقامت کا ثبوت نہ دے سکے۔ جیسا کہ دستاویزات میں تیرہ منحرفین کا ذکر ہے جنھوں نے تحریک کو نقصان پہنچایا اور انگریزی سی آئی ڈی کو معلومات فراہم کیں۔ حتیٰ کہ شیخ الہند کے انتہائی معتمد علیہ اور زمانۂ سفرِ حجاز میں ان کی طرف سے ان کے قائم مقام مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری جیسے شخص بھی ثابت قدم نہ رہ سکے اور انگریز کے سامنے تحریک کے سلسلے میں عائد کردہ تمام الزامات کا انکار کر دیا اور بعض میں لاعلمی کا اظہار کیا۔[2]

مولانا غلام رسول مہر نے بھی ان چیزوں کا اعتراف کیا ہے جن کی ہم صراحت کر رہے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو "تحریک شیخ الہند" صفحات بالترتیب ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۹۶، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱ - ۴۱۹ - ۴۴۷ - ۴۵۰ - ۴۵۲ - ۴۶۵ - ۴۷۰ - ۴۷۵ - ۴۸۲ - ۴۸۵ -

[2] دلائل و براہین سے مزین، ص ...

چنانچہ مولانا مہر لکھتے ہیں :-

"شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نے آزادی کی جو تحریک منظم کی تھی، اگرچہ اسے براہ راست جماعت مجاہدین سے تعلق نہ تھا ..... تاہم دونوں تحریکوں میں اشتراک کے کئی پہلو موجود تھے۔ دونوں کا سلسلۂ ارادت شاہ اسمٰعیل شہید رح اور سید احمد شہید رح پر منتہی ہوتا تھا، دونوں کے مقاصد میں خاصی یکسانی تھی۔ دونوں مسلمانوں کی سربلندی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں تھیں .... پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہند کے مقرر فرمائے ہوئے کارکن بوقتِ ضرورت جماعت مجاہدین سے مدد لیتے رہے۔ دونوں جماعتوں کے کارکنوں کو جہاں ایک دائرے میں کام کا موقع ملا، وہ اشتراک پر کاربند رہے۔" [۱]

بہرحال یہ خالص دیوبندی تحریک نہیں تھی بلکہ اس سے قبل وہابی علماء کی قیادت میں انگریز کے خلاف جو تحریکِ جہاد چل رہی تھی، اس کے افراد بھی اس میں شامل تھے اور وہابی علماء و مجاہدین نے بھی اس تحریک میں پورا تعاون کیا ہے۔

۶- یہ تحریک اپنوں (دیوبندیوں) کی ہی کمزوریوں کی وجہ سے کوئی مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہی کئی حضرات تو سرے سے تحریک کے اغراض و مقاصد سے ہی منحرف ہو گئے۔ اس قسم کے تیرہ منحرفین کے نام "تحریکِ شیخ الہند" میں بھی دیئے گئے ہیں۔ دیوبندی حضرات اُس عزم و استقامت کے مظاہرے میں ناکام رہے جو کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہے خود مولانا حسین احمد مدنی نے جس تضاد بیانی کا مظاہرہ فرمایا ہے وہ اربابِ عزیمت کے مقام سے بہت فروتر ہے۔ "اسیرِ مالٹا" کتاب میں انھوں نے پورے وثوق و قطعیت سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہند نے نہ غالب پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں، نہ ان کے لیے ایسا کوئی موقع تھا لیکن "نقشِ حیات" میں ایک ایک شے کا تفصیلاً ذکر فرمایا اور ساتھ ہی اس طرزِ عمل کے جواز کی دو توجیہیں پیش کی ہیں۔

۱- تعریضی جواب دینا، جن کے دو معنی ہوں، متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور

---

[۱] "سرگزشتِ مجاہدین" ص ۵۵۲ - نواں باب۔

سمجھے، یہ جھوٹ نہیں ہے اور ایسے موقعے پر بلا شبہ جائز ہے۔

مولانا غلام رسول مہر مولانا مدنی کی اس تاویل و توجیہہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تعریضی جواب" کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن دوسری صورت کے متعلق جب مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگ جواز کا فتویٰ دیں تو میرے جیسے فرومایہ علم کے لیے کچھ عرض کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے، تاہم صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ دل اس پر مطمئن نہیں۔ اور اگر ذاتی تحفظ کے مسئلے کو اسی انداز میں قبول کر لیا جائے۔ جس انداز میں اسے پیش کیا گیا ہے تو پھر مجاہدانہ کارناموں اور ان کے ضمن میں قربانیوں کا معاملہ ختم سمجھنا چاہیئے اور تسلیم کر لینا چاہیئے کہ عزیمت کوئی شئی نہیں، جو کچھ ہے رخصت ہی رخصت ہے۔ نصب العین کے لیے کام ایسے طریق پر کرنا کہ جان کو کوئی گزند نہ پہنچے گزند کا اندیشہ ہو تو مقدم شئی جان کا تحفظ ہے، خواہ نصب العین کا حشر کچھ ہو۔ جب تک تاریخ کے صفحات سے عزیمت کے تمام واقعات دھونڈ ڈالے جائیں، اس مسلک کو دل کیوں کر قبول کر سکتا ہے؟ جو مولانا حسین احمد مدنی نے پیش فرمایا ہے۔" [1]

لیکن راقم کے خیال میں بات صرف عزیمت یا غیر عزیمت کی ہی نہیں بلکہ اس میں کچھ مسئلہ تاریخ سازی کا بھی ہے۔ دیوبندی اکابر و اصاغر نے جس طرح غلط و صحیح استخلاص وطن کی تحاریک آزادی کا سارا کریڈٹ اپنے دیوبندی بزرگوں کو دینے کی مساعی شروع کی ہیں، اس کی بنا پر وہ اس قسم کے تضادات کو نبھانے کے لیے دُور از کار تاویلات کا سہارا لینے پر مجبور ہیں کہ اس کے بغیر تاریخ سازی ممکن نہیں۔

بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ تحریک میں شامل دیوبندی حضرات کے طرزِ عمل سے تحریک ناکامی سے دوچار رہی۔ اگرچہ ظاہری کامیابی یا ناکامیابی دینی تحریکوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس کا مدارِ عمل خالص نیت اور صحیح طریق کار پہ ہے، اگر کسی تحریک میں یہ چیزیں موجود ہیں تو ظاہری

---

[1] "سرگزشت مجاہدین" صفحہ ۵۶۲

ناکامی کے باوجود بھی وہ کامیاب ہیں اور اس کے برعکس صورت میں ظاہری کامیابی بھی عنداللہ کامیابی متصور نہیں ہوگی۔

حضرت شیخ الہند وغیرہ کی نیت یقیناً صحیح ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ تحریک کی کامیابی کے لیے جو طریق کار اور جس طرح کے رجالِ کار کی ضرورت تھی، وہ اس تحریک کو میسر نہ آسکے۔ دیوبندی اکابر کی اکثریت اس تحریک سے غیر متعلق رہی اور جو چند حضرات اس میں شریک ہوئے ان کی اکثریت علم و عمل کے اعتبار سے خاص امتیازی حیثیت کی حامل نہ تھی۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم لکھتے ہیں:۔

"حضرت مرحوم (شیخ الہند) نے جس جذبے اخلاص، ہمت اور والہیت سے کام کیا، اس کے بارے میں عاجز کیا کہہ سکتا ہے جو ان اوصاف و خصائص کا صحیح اندازہ بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اصل منصوبہ جن حالات میں تیار کیا گیا، وہ صد درجہ ناساز گار تھے۔ چھان بین اور غور و فکر کی مہلت قطعاً میسر نہ تھی . . . . چونکہ پورا منصوبہ عالمِ اضطرار میں تیار ہوا تھا، اس لیے اس کا کوئی پہلو بھی پائدار ثابت نہ ہوا . . . . حضرت کے تمام کارکن علم و فضل، زہد و تقویٰ، بے غرضی و بےنفسی اور جرأت و ایثار میں اپنی مثال آپ تھے . . . . ان میں سے کسی کی حرارتِ اسلامیت و آزادی آخری سانس تک ایک لمحے کے لیے بھی افسردہ ہوئی لیکن مجھے بہ صد ادب یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ حضرات جن کاموں پر مامور ہوئے ان کے لیے ہر لحاظ سے موزون نہ تھے، جو جرنیل خطرناک مقامات پر فوجوں کے علمدار بننے کی ہمت رکھتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ سیاسی مجالس میں بھی ویسے ہی اہم کارنامے انجام دے سکیں۔" [1]

۷۔ تحریک کے ایام میں بھی دارالعلوم دیوبند بحیثیت جماعت کے تحریک سے نہ صرف علیحدہ رہا بلکہ تحریک کے مقاصد کے برعکس انگریزی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اکابرِ دیوبند تحریک سے الگ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ

[1] سرگزشتِ مجاہدین صفحہ ۵۶۱

جب شیخ الہند، مولانا مدنی اور دیگر شرکاءِ تحریک کی گرفتاری عمل میں آئی، تب بھی دارالعلوم دیوبند پر کوئی افتاد نہ آئی اور یہاں داروگیر کا کوئی چکر نہیں چلا بلکہ اسے چند افراد کا انفرادی و شخصی معاملہ ہی سمجھا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً دیگر ذمہ داران دارالعلوم کا انگریزی حکومت کے عتاب سے بچ رہنا ممکن نہ ہوتا۔

علاوہ ازیں شیخ الہند وغیرہ کی گرفتاری کے بعد علمائے دیوبند نے جو روش اختیار کی، اس سے تو یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ علمائے دیوبند کا اُس وقت کی سیاسی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور سیاست سے وہ بالکل الگ تھلگ رہے ہے۔ چنانچہ گرفتاری کے بعد علمائے دیوبند نے شیخ الہند وغیرہ کی رہائی کے لیے جو کوششیں کیں، ان میں انھوں نے تین باتوں کو خاص طور پر نمایاں کیا۔

- ایک یہ کہ شیخ الہند کی گرفتاری غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔
- دوسرے یہ کہ وہ جماعت دیوبند ہی کی طرح سیاسی الجھنوں سے الگ تھلگ رہے ہیں۔
- تیسرے یہ کہ علمائے دیوبند کی جماعت بالکل خاموش اور سیاست سے یکسر بیگانہ ہے۔

اس قسم کی تحریکوں سے اس کو کوئی مناسبت نہیں۔

چنانچہ نومبر ۱۹۱۷ء کو علمائے دیوبند نے انگریز گورنر کو جو متفقہ عرضداشت اس سلسلے میں پیش کی، اس میں یہ تکرار و باصرار یہ تین باتیں دھرائی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں یہ پوری عرضداشت مع اُس تمہید کے جو ماہنامہ "الرشید" دارالعلوم دیوبند کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، نقل کرتے ہیں۔ اس عرضداشت کی روشنی میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس دور میں، جبکہ تحریکِ جہاد کے وہابی مجاہدین تنہا سر بکف انگریزوں سے نبرد آزما تھے، علمائے دیوبند کی سیاسی خدمات کا طول و عرض اور مجاہدانہ کارناموں کا حدود اربعہ کیا ہے جس کا آج کل بڑا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

(عرضداشت کا پورا متن "الرشید" دیوبند کے ادارتی نوٹ کے ساتھ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)

"حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی نظر بندی

اور

رہائی کے لیے مساعی

ہم علمائے دیوبند کے اُس وفد کا حال اختصار کے ساتھ شائع کر چکے تھے جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو بمقام میرٹھ بحضور لاٹ صاحب بہادر صوبہ متحدہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور جس نے مؤدبانہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم و دام فیضہم کے متعلق عرض کیا تھا اور حضور ممدوح نے بکمال تلطف امید افزا جواب دیا تھا۔ ہم یہ بھی ظاہر کر چکے ہیں کہ وفد کے پیش کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کئی ماہ پیشتر سے تحریک جاری تھی۔ مگر حضور ممدوح کو کثرت اشغال کی وجہ سے قبل از ۲ نومبر اجازت حاضری وفد کا موقع نہ ملا۔ اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ وفد نے حضور ممدوح کی خدمت میں ایک "عرضداشت" پیش کی تھی، ہم نتیجہ کے منتظر تھے اور اسی وجہ سے وفد کے متعلق صرف بغرض اطلاع اہل اسلام جن کے قلوب حضرت مولانا ممدوح کی نظر بندی سے بے چین تھے۔ اتنے ہی اعلان کو کافی سمجھا تھا۔ کہ وفد نے حاضر ہو کر عرض کیا اور حضرت ممدوح نے حوصلہ افزا جواب عطا فرمایا۔ اور باوجود تقاضائے ہمدردان اُس تحریر کو شائع نہ کیا تھا۔ لیکن جبکہ باوجود انتظار شدید اب تک نتیجہ کا ظہور نہیں ہوا۔ ادھر اکثر حضرات ہم سے اُس تحریر کی نقل طلب کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قدر کثرت کے ساتھ نقول کا بھیجنا سہل نہیں ہے۔ اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو طبع کر کے شائع کر دیا جائے۔ اس تحریر کو دیکھ کر وہ حضرات بھی اپنا اطمینان فرمالیں۔

جن کو بعض بروایاتِ غلط کی بنا پر یا بعض اپنے تخیلاتِ ذاتی کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وفدِ علماء نے حضرت مولانا کے مجرم ہونے کو تسلیم کرکے درخواست ترحم پیش کی تھی۔ تحریر خود اپنے مضمون کو تبلاتی ہے۔ اور زبانی بھی جو کچھ عرض کیا گیا۔ وہ یہی تھا کہ مولانا کی طرف جو خیالات منسوب کیے جاتے ہیں۔ مولانا کا یہ طریقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور اسی کی تائید میں حضرت مولانا کے قلم کا لکھا ہوا فتویٰ دکھلا چکے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تحریراً و تقریراً ادب حکومت کو ملحوظ رکھ کر عرض کیا گیا تھا۔ اور اسی طریقہ کو ہم نے پسند کیا۔"

نقل عرضداشت وفد علمائے دیوبند جو بتاریخ ۶ نومبر ۱۹۱۷ء ہز آنر سر جیمیس میسٹن بہادر کے سی ایس آئی لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ بمقام میرٹھ پیش کی گئی اور سنائی گئی۔

بحضور عالی جناب معلی القاب ہز آنر سر جیمیس اسکارجی میسٹن صاحب بہادر کے سی، ایس آئی لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

حضور والا۔ ہم چند خدام دارالعلوم دیوبند بحیثیت یک خالص مذہبی جماعت کی مرکزی نمائندگی کے آج ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف ہز آنر کی توجہ گرامی منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ جو اپنی بعض سیاسی حیثیات سے اگرچہ ہمارے دائرہ بحث کے اندر داخل نہ ہو لیکن اُس کا وہ مذہبی پہلو جس کا تعلق دارالعلوم سے اور دارالعلوم کی کارکن جماعت سے اور دارالعلوم کے مددکرنے والے عام مسلمانوں سے ہے۔ کسی وقت بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا۔

حضور والا! ہم اپنی اُسی فطری سادگی اور صفائی کی راہ سے جس نے ایک دور

از تکلف کے مذہب کے سایہ میں تربیت پائی ہے۔ اور جس کو ہز آنر کی مہربانی سے گورنمنٹ کے عمل نے بھی آج تک مرہون ضوابط نہیں بنایا) اس وقت جو کچھ نہایت مؤدبانہ گزارش کریں گے۔ ممکن ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے ہز آنر کے یا گورنمنٹ کے بعض دوسرے اعلیٰ حکام کے مزاج کو منغص بنا دے

لیکن سچ ہے (اور سچ ہی ہمکو ہمیشہ کہنا چاہیئے) کہ حالات حاضرہ ہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہم کو ایک ایسے معاملہ میں دخل دینے کی ہدایت کی ہے۔ جس میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانان ہند کے واحد مذہبی مرکز کا سب سے بڑا اعزاز اور ہندوستان کی عام پبلک کے حق میں نہایت ہی تسکین واطمینان کا باعث اور خود حکام گورنمنٹ کے لیے بھی بجائے اس وقتی تکدر کے بڑی حد تک حقیقی راحت وسہولت حاصل ہونے کی ضمانت اور اُس کی مدبرانہ حکمت عملی کا جس سے کہ عام اہلِ اسلام کے قلوب مسخر ہو جائیں۔ ایک گہرا ثبوت ہوگا۔

ہماری جماعت کے محسن شفیق ہز آنر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس کی غیر متوقع نظر بندی سے (خواہ وہ گورنمنٹ کے نزدیک کیسی ہی قوی دلیل پر مبنی ہو) **دَارُ الْعُلُوم** کی اجتماعی حالت کو ایک صدمہ عظیم برداشت کرنا پڑا ہے اور اب بار بار اُن کی رہائی کی امیدیں قائم کرتے رہنے کے بعد دارالعلوم کے دوست اور اُس کے کثیر التعداد مستفیدین اُن کی طویل مفارقت سے نہایت ہی بے چین اور شکستہ خاطر ہو کر دارالعلوم کی مرکزی حیثیت اور اس کے وفد کے سالارِ قافلہ شمس العلماء مولانا مولوی حافظ محمد احمد صاحب کے رسوخ ووجاہتِ خداداد سے اپنی آخری امید وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ جس میں اوّلاً خدا کی رحمت اور ثانیاً ہز آنر کی عنایاتِ خاصہ سے توقع ہے کہ وہ مایوس نہ کیے جائیں گے۔

اس بات کے اظہار کی ہم چنداں ضرورت نہیں سمجھتے کہ ہماری جماعت ایک قدامت پسند جماعت ہے۔ جس کو قدرتی طور پر طلب حقوق یا عرض مدعا کے نئے نئے طور طریق سے جو آج کل مروج ہیں، قطعاً مناسبت نہیں۔

پھر نہ تو ہمارے ہم مذہب آنریبل موجود ہیں۔ جو کونسلوں میں ہماری کسی خواہش کے متعلق مسلسل جدّوجہد جاری رکھیں اور نہ انگریزی تعلیم نے ہمارے دماغوں کو ایسا منوّر بنایا ہے کہ اپنی معروضات کو منوانے کے لیے ہم آئرلینڈ یا کم از کم نیشنل کانگریس کی کورانہ تقلید میں آئینی یا غیر آئینی ایجیٹیشن برپا کرنے لگیں۔ جس کو ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے ادب حکومت کے متعلق سخت ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہم کو بلاشُبہ خیرخواہانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ قانون کی حدود میں رہ کر ہی شوروغل مچاؤ تو تمہارے نظربند بھی مسز اینی بسنٹ کی طرح آزاد کر دیئے جائیں گے۔ لیکن خواہ ہم کو کوئی خوشامدی اور ڈرپوک کہے یا دوراندیش اور سمجھدار۔ ہم نے یہی کہا کہ اوّل تو عام نظربندوں کے معاملہ میں مسز اینی بسنٹ کی نظیر ہماری پوری راہنمائی نہیں کرتی۔ دوسرے اگر ہم چند تیز رزولیوشن پاس کر کے اور دو چار تار حضور وسیرائے بہادر اور سیکرٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں بھیج کر غوغائے عام میں شریک بھی ہو جائیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہونا ہے کہ ہم اپنے خاموش مسلک پر ثابت قدم رہنے سے جو کچھ فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔ اُس کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں۔

حضور والا۔ یہ نکتہ خاص طور پر ہز آنر جیسے بیدار مغز حاکم کی توجہ کے قابل ہے کہ مسز اینی بسنٹ کے واقعہ سے جو یورپین ایسوسی ایشن کے ذہین ارکان کو یہ خیال پھیل جانے کا اندیشہ پیدا ہوا ہے، کہ گورنمنٹ کے دربار میں بے ادب شوروغل مچانے اور ایجیٹیشن برپا کرنے والے بہ نسبت مہذب اعتدال پسندوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اگر یہ اندیشہ کسی درجے میں وزن رکھتا ہے تو اُس کی تلافی کا طریقہ بھی غالباً اس سے بہتر اس وقت کوئی نہ ہوگا۔ کہ گورنمنٹ ایک بالکل خاموش اور سیاسیات سے محض بے گانہ جماعت کی استدعا پر حضرت مولانا محمود حسن صاحب کو فوری آزادی مرحمت فرما کر ہماری کل جماعت بلکہ کُل اسلامی پبلک کے قلوب سے خراج منت پذیری واحسان شناسی وصول کرے اور اپنے اس طریقِ عمل سے عام طور پر ثابت کر دے کہ خاموش امن پسند بھی ایجیٹیٹروں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حضور والا تیس چالیس برس کے کامل تجربے کے بعد ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب ساری عمر تمام جماعت دیوبند ہی کی طرح سیاسی الجھنوں سے الگ تھلگ رہے۔ نہ تو وہ کوئی وطن پرست آدمی ہیں۔ اور نہ قوم پرست بلکہ ایک سچے خدا پرست انسان ہیں۔ اور انسان جب تک انسان ہے، سہو و نسیان اور غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک پاکباز انسان بدنیت نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ہمارے واسطے اپنے سابق چہل سالہ تجربہ اور حضرت مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی بعض تحریروں پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ کا یہ اعلان کہ "تحریری اور دوسری قسم کے شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب نے ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی فوجی تجاویز میں مدد دی"! اگرچہ نہایت حیرت انگیز اور رنجدہ ہے۔ لیکن جبکہ ان تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے واقف ہونے اور ان کے پرکھنے کا ہمارے لیے کوئی موقع نہیں ہے۔ تو ہم راستہ کو مختصر کرنے کے لیے صرف اسی قدر گذارش کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر مولانا ممدوح کی آواز گورنمنٹ کے کانوں میں چند سیاسی لوگوں کی آواز کے ساتھ ملتبس ہو کر پہنچی ہے تب بھی وہ ازراہ کرم گستری و رعایا نوازی ایک ایسی شخصیت کے آزاد کرنے میں دریغ نہ کرے۔ جس کی آزادی سے ایک عظیم الشان جماعت اسلام کے جذبات اسیر احسان ہو جائیں گے اور دارالعلوم کے در و دیوار میں سے عمیق شکر گذاری کا ایک ایسا ابلتا ہوا جوش نظر آئے گا۔ جو شاید اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا ہو۔

ہم کو ہز آنر کے ان وسیع اخلاق والطاف سے جو آج تک ہماری جماعت کی نسبت کام فرمائے گئے ہیں۔ کامل یقین ہے کہ ہماری یہ عرضداشت بے اثر نہیں جائیگی اور ہز آنر کوئی ممکن مہربانی اس معاملہ میں اٹھا کر نہیں رکھیں گے۔

آخر میں ہم سمع خراشی کی معافی چاہتے ہیں۔ دعائے کامیابی و فلاح پر اس ناچیز تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

ہم ہیں آپ کے صادق خیر اندیش اور دعا کیش علمائے دیوبند ۱۸ محرم ۱۳۳۶ھ / ۶ نومبر ۱۹۱۷ء"

(منقول از "الرشید" دیوبند، رجب ۱۳۳۶ھ)

حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی نظربندی

اور

رہائی کیلئے مساعی

"ہم سلمانے دیوبند کے اُس وفد کا حال اختصار کے ساتھ شائع کر چکے تھے جو ۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہز آنر سر
بحضور لاٹ صاحب بہادر صوبہ متحدہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور جس نے مؤدبانہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب
مدظلہم و دام فیضہم کے متعلق عرض کیا تھا۔ اور حضور ممدوح نے بکمال لطف امید افزا جواب دیا تھا۔ ہم یہ بھی
ظاہر کر چکے ہیں کہ وفد کے پیش کرنے کی اجازت حاصل کرنیکے لئے کئی ماہ پیشتر سے تحریک جاری تھی۔ مگر حضور
ممدوح کو کثرت اشغال کی وجہ سے قبل اخیر نومبر اجازت حاضری وفد کا موقع نہ تھا۔ اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں
کہ وفد نے حضور ممدوح کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی تھی۔ ہم توجہ کے منتظر تھے اور اسی وجہ سے
وفد کے متعلق صرف نفس اطلاع اہل اسلام جنکے قلوب حضرت مولانا ممدوح کی نظربندی سے بے چین تھے
اتنے ہی اطلاع کو کافی سمجھا تھا۔ کہ وفد نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ اور حضور ممدوح نے جو جواب عطا
فرمایا۔ اور باوجود تقاضائے ہمدردان اُس تحریر کو شائع نہ کیا تھا لیکن جبکہ باوجود انتظار [illegible] اب تک
نتیجہ کا ظہور نہیں ہوا۔ ادھر اکثر حضرات ہم سے اُس تحریر کی نقل طلب کرتے ہیں۔ اور یہ خیال ہو رہا ہے کہ مفید کثرت
کے ساتھ مقبول کا بعینہٖ حصول نہیں ہے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو طبع کرکے شائع کر دیا جاوے
اس تحریر کو دیکھ کر وہ حضرات بھی اپنا اطمینان فرمالیں جنکو بعض روایات غلط کی بنا پر یا بعض دیگر تخیلات ذاتی
کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وفد علما نے حضرت مولانا کے مجرم ہونے کو تسلیم کرکے درخواست ترحم پیش کی تھی
تحریر خود اپنے مضمون کو بتلاتی ہے اور زبانی بھی جو کچھ عرض کیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ [illegible] طرف توجہ [illegible]

منسوب کئے جاتے ہیں۔ مولانا کا یہ طریقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور اسی کی تائید میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اس سے قبل ۲۰ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو بمقام لکھنؤ حضرت مولانا کے قلم کا لکھا ہوا فتوے دکھلا چکے تھے۔ ہاں ضرور ہے کہ تحریراً و تقریراً ادب حکومت کو ملحوظ رکھکر عرض کیا گیا تھا۔ لیکن اس طریقہ کو بھی پسند کیا۔"

نقل عرضداشت وفد علمائے دیوبند جو بتاریخ ۶ر نومبر ۱۹۱۷ء ہز آنر سر جیمس میسٹن بہادر کے سی ایس آئی لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ بمقام میرٹھ پیش کیگئی اور سنائی گئی

بحضور عالیجناب معلی القاب ہز آنر سر جیمس اسکارجی میسٹن صاحب بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

حضور والا۔ ہم چند خدام دارالعلوم دیوبند بحیثیت ایک خالص مذہبی جماعت کی مرکزی نمائندگی کے آج ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف **ہز آنر** کی توجہ گرامی منعطف کرانا چاہتے ہیں جو اپنی بعض سیاسی حیثیات سے اگرچہ ہمارے دائرہ بحث کے اندر داخل نہ ہو **لیکن** اُسکا وہ مذہبی پہلو جسکا تعلق دارالعلوم سے اور دارالعلوم کی کارکن جماعت اور دارالعلوم کے مددگار ہونیوالے تمام مسلمانوں سے ہے۔ کسی وقت بھی نظرانداز نہیں ہوسکتا۔

حضور والا۔ ہم اپنی اسی فطری سادگی اور صفائی کی راہ سے جسنے ایک دراز مختلف مذہب کے سایہ میں تربیت پائی ہے اور جسکو ہز آنر کی مہربانی سے گورنمنٹ کے عمل نے بھی چند مدون ضوابط نہیں بنایا اسوقت جو کچھ نہایت مؤدبانہ گذارش کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے تھوڑی دیر کیلئے ہز آنر کے یا گورنمنٹ کے بعض دوسرے اعلیٰ حکام کے مزاج کو منغص کر دے لیکن سچ یہ ہے اور سچ ہی ہمکو ہمیشہ کہنا چاہئے کہ حالات حاضرہ ہی وہ چیز ہیں جنھوں نے ہمکو ایک ایسے حاجت مند وفد کی رعایت کی ہے جسمیں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانان ہند کے واحد مذہبی مرکز کا سب سے بڑا اعزاز اور ہندوستان کی وفادار قوم کے لئے بہت ہی تسکین و اطمینان کا باعث اور خود حکام گورنمنٹ کیلئے بھی جو اس وقت غدر کے بڑی حد تک حقیقی راحت و سہولت حاصل ہوگی صاحب تدبر اور اُنکی مدبرانہ حکمت عملی کا جس سے کہ عام

اہل اسلام کے قلوب مسخر ہو جائیں ایک گہرا ثبوت ہو گا۔

ہماری جماعت کے محسن شفیق ہز آنر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر مدرس کی غیر متوقع نظر بندی سے (خواہ وہ گورنمنٹ کے نزدیک کیسی ہی قوی دلائل پر مبنی ہو) دارالعلوم کی اجتماعی حالت کو ایک صدمہ عظیم برداشت کرنا پڑا ہے اور اب بار بار انکی رہائی کی امیدیں قائم ہو کر ٹوٹ جانے کے بعد دارالعلوم کے دوست اور اسکے کثیر التعداد مستفیدین انکی طویل مفارقت سے نہایت ہی بے چین اور شکستہ خاطر ہو کر دارالعلوم کی مرکزی حیثیت اور اس وفد کے سالار قافلہ شمس العلما مولانا مولوی حافظ محمد احمد صاحب کے رسوخ و وجاہت خداداد سے اپنی آخری امید وابستہ کئے ہوئے ہیں جسمیں اولاً خدا کی رحمت اور ثانیاً ہز آنر کی عنایات خاصہ سے توقع ہے کہ وہ مایوس نہ کئے جاینگے۔

اس بات کے اظہار کی ہم چنداں ضرورت نہیں سمجھتے کہ ہماری جماعت ایک قدامت پسند جماعت ہے جسکو قدرتی طور پر طلب حقوق یا عرض مدعا کے نئے نئے طور و طریق سے جو آجکل مروج ہیں قطعاً مناسبت نہیں۔

پھر تو ہمارے ہم مشرب آنریبل موجود ہیں جو کونسلوں میں ہماری کسی خواہش کے متعلق مسلسل جد و جہد جاری رکھیں اور نہ انگریزی تعلیم نے ہمارے دماغوں کو ایسا منور بنایا ہے کہ اپنی معروضات کو منوانیکے لئے ہم آنریبل ہوم رول یا نیشنل کانگرس کی کورانہ تقلید میں آئینی یا غیر آئینی ایجیٹیشن برپا کرنے لگیں۔ جسکو ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے ادب حکومت کے متعلق سخت ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہم کو بلاشبہ خیر خواہانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ قانون کی حدود میں رہکر ہی شور و غل مچاؤ تو تمہارے نظر بند بھی مسز اینی بسنٹ کی طرح آزاد کر دئے جاینگے۔ لیکن خواہ ہمکو کوئی خوشامدی اور ڈرپوک کہے یا دور اندیش اور سمجھدار ہم نے یہی کہا کہ اول تو عام نظر بندی کے معاملہ میں مسز اینی بسنٹ کی نظیر ہماری پوری رہنمائی نہیں کرتی۔ دوسرے اگر ہم چند تیز رزولیشن پاس کر کے اور دو چار تار حضور ویسرائے بہادر اور سکریٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں بھیجکر غوغائے عام میں شریک بھی ہو جاتے تو اسکا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوتا کہ ہم اپنے خاموش مسلک پر ثابت قدم رہنے سے جو کچھ فائدہ حاصل کر سکتے تھے اسکو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھتے۔

حضور والا۔ یہ نکتہ خاص طور پر ہز آنر جیسے بیدار مغز حاکم کی توجہ کے قابل ہے کہ مسز اینی بسنٹ کے واقعہ سے تو ہوم رول لیگ اور انجمن ایسوسی ایشن کے ذہین ارکان کو یہ خیال پھیل جانیکا اندیشہ پیدا ہو آیا ہے کہ گورنمنٹ کے دربار میں بے ادب شور و غل مچانے اور ایجیٹیشن برپا کرنے والے بہ نسبت مذہب اعتدال پسند لوگوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر یہ اندیشہ کسی درجہ میں وزن رکھتا ہے تو اسکی تلافی کا طریقہ بھی غالباً اس سے بہتر موقع کوئی نہ ہو گا کہ گورنمنٹ ایک بالکل خاموش اور سیاسیات سے محض بیگانہ جماعت کی استدعا حضرت مولانا محمود حسن صاحب کو فوری آزادی مرحمت فرما کر ہماری کل جماعت بلکہ کل اسلامی پبلک کے قلوب سے خراج منت پذیری وصول

احسان شناسی وصول کرے اور ایز اس عرصہ میں عام طور پر ثابت کر دی کہ خاموش امن پسند بھی ایجیٹیٹروں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں

حضور والا تین چالیس برس کے کامل تجربے کے بعد ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور ساری ہماری

تمام جماعت دیوبند ہی کی طرح سیاسی انجمنوں سے الگ تھلگ رہی۔ نہ تو وہ کوئی وطن پرست آدمی ہیں اور نہ قوم پرست بلکہ ایک سچے

خدا پرست انسان ہیں اور انسان ہیں جب تک کہ انسان ہیں، سہو و نسیان اور غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے لیکن ایک پاکباز انسان بدنیت نہیں ہو سکتا

اس لئے ہمارے واسطے اپنے سابق چہل سالہ تجربہ اور حضرت مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی بعض تحریروں پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ

صوبہ جات متحدہ کا یہ اعلان کہ " تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب نے

ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو انکی فوجی تجاویز میں مدد دی " اگرچہ نہایت ہی حیرت انگیز اور رنجدہ ہے لیکن جب ان تحریری

اور دوسری قسم کی شہادتوں سے واقف ہونے اور ان کے پرکھنے کا ہمارے لئے کوئی موقع نہیں ہے تو ہم اس سے کو مختصر

کرنیکے لئے صرف اسی قدر گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت مولانا ممدوح کی آواز گورنمنٹ کے کانوں میں چند سیاسی

لوگوں کی آواز کے ساتھ ملتبس ہو کر پہنچی ہے تب بھی وہ از راہ کرم گستری و رعایا نوازی ایک ایسی شخصیت کے آزاد کرنے میں دریغ

نکرے جسکی آزادی سے ایک عظیم الشان جماعت اسلام کے جذبات اسیر احسان ہو جائیں گے۔ اور دارالعلوم کے در و دیوار میں سے

عمیق شکر گزاری کا ایک ایسا اُبلتا ہوا جوش نظر آئیگا جو شاید اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا ہو۔

ہم کو ہز آنر کے اُن وسیع اخلاق و الطاف سے جو آج تک ہماری جماعت کی نسبت کام فرمائے گئے ہیں کامل اطمینان ہے

کہ ہماری یہ عرض داشت بے اثر نہیں جائیگی۔ اور ہز آنر کوئی ممکن مہربانی اس معاملہ میں اُٹھا کر نہیں رکھینگے۔

آخر میں ہم سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے دولت کی کامیابی و فلاح پر اس ناچیز تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

ہم ہیں آپ کے صادق خیر اندیش اور وفا کیش

علمائے دیوبند

۱۰ / محرم ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۶ / نومبر ۱۹۱۷ء

عرضداشت کی روشنی میں

علمائے دیوبند کی اس متفقہ عرضداشت سے مندرجہ ذیل امور واضح ہیں کہ

- مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے متعلق جو باور کرایا جاتا ہے کہ انہوں نے تحریک ریشمی رومال کے ذریعے سے انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ یہ خلافِ واقعہ ہے، انہوں نے انگریز کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔
- مولانا محمود حسن مرحوم کی گرفتاری محض شبہات کا نتیجہ تھی۔
- مولانا محمود حسن سمیت تمام جماعت دیوبند سیاسی الجھنوں سے الگ تھلگ اور وطن پرستی یا قوم پرستی سے (جس کے باعث انسان بالعموم سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے) وہ پاک رہی ہے۔
- دیوبندی جماعت "ایک بالکل خاموش اور سیاسیات سے محض بیگانہ جماعت ہے"
- یہ عرض داشت ۱۹۱۷ء کی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کم از کم ۱۹۱۷ء سے پہلے پہلے علمائے دیوبند کے متفقہ اعتراف کے مطابق علمائے دیوبند کا تحریکِ جہاد یا تحریکِ استخلاصِ وطن یا کسی بھی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کا ثبوت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے اور ان کو سیاسی سرگرمیوں میں شریک گردانتا ہے تو اس کا دعویٰ غلط ہے۔

اس متفقہ عرض داشت سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ علمائے دیوبند کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ہیرو ثابت کرنا یا ان کو تحریکِ جہاد کا قائد باور کرانا سراسر تاریخ سازی ہے۔

شیخ الہند کے اولین سوانح نگاروں کے بیانات سے تائید

گزشتہ تفصیلات سے اگرچہ دیوبندی اکابر کی سیاسی خدمات کا طُول و عرض واضح ہو جاتا ہے تاہم اس ضمن میں مزید قرائن و شواہد کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اس لیے وہ بھی ملاحظہ فرمالیے جائیں۔ اس سلسلے میں ہم شیخ الہند کے اولین دو مستند سوانح نگاروں کے بیانات ذکر کریں گے۔

تحریک ریشمی رومال کے دو رُخ بتلائے جاتے ہیں۔

"ایک بیرون ہند انگریزوں کے خلاف پروپگنڈہ اور مختلف ملکوں میں اپنے سفیر اور ایلچی بھیج کر بیرونی طاقتوں سے امداد لینا۔ اور اس تحریک کا دوسرا رُخ تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا اور ان کو باہر سے پیدا ہونے والے انقلاب کی مدد کرنے کے لیے تیار کرنا"، ("برہان" دہلی، نومبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۶۵، مضمون "علمائے ہند کا سیاسی موقف" از مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم)

شیخ الہند مولانا محمود حسن کا سفر حجاز اور وہاں ترکی عمائدین غالب پاشا اور انور پاشا وغیرہ سے ملاقات اسی پہلے مقصد کی خاطر بتلائی جاتی ہے۔ لیکن "اسیر مالٹا" نامی کتاب، جو اس سفر اور اس میں پیش آمدہ واقعات کی سب سے زیادہ مستند اور معتبر کتاب ہے اور جس کے مصنف، مولانا حسین احمد مدنی مرحوم رفیقِ سفر کے طور پر شیخ الہند کے شریکِ جلوت و خلوت رہے ہیں۔ اس میں سفر حجاز کا مقصد یہ بتلایا گیا ہے۔ کہ جنگ بلقان و طرابلس کے موقع پر مولانا محمود حسن مرحوم ترکی خلافت کے ہمدرد و خیر خواہ تھے اور اسی اسلامی خیر خواہی میں وہ اُن فتاووں اور بیانات کے خلاف تھے جو انگریزوں کے ایماء پر حکومتِ ترکی کے خلاف دیئے جا رہے تھے۔ اسی چیز نے انگریزی گورنمنٹ کو ان سے بدظن کر دیا اور مولانا مرحوم کی گرفتاری کا اندیشہ پیدا ہو گیا جس سے بچنے کے لیے آپ نے حجاز کا قصد فرمایا۔ چنانچہ مولانا مدنی مرحوم

سیدھے روانہ ہو کر عرفات میں آکر شریکِ حج ہوا تھا۔ مولانا مرحوم بھی حج سے پہلے مکہ معظمہ سے باہر کہیں تشریف نہیں لے گئے۔ البتہ حج کے بعد وہ مکہ معظمہ آیا، مگر چونکہ محمل شامی آیا ہوا تھا اور اس کے مہتمم وزیر جنگ انور پاشا کے والد ماجد تھے، اس لیے گورنر موصوف کو اپنے رسمی کاروبار سے اتنی بھی مہلت نہ تھی کہ کسی سے بات تک کر سکتے۔ تمام محمل کے انتظامات، خزانہ کی افکار، انور پاشا کے والد ماجد کی تکریمات حج کے انتظامات، شہر کی کاروائیاں، دور دراز سے آنے والے ترکی افسروں سے ملاقات وغیرہ وغیرہ اس قدر کاروبار تھے جن کی بنا پر اس کو اتنی مہلت کہاں تھی کہ مولانا سے ابتدائی ملاقات اور ربط و ضبط کی نوبت آئے اور پھر وہ روابط اس درجہ کے قابل اعتماد ہو جائیں کہ شاہی عہد نامے اور وثائق کے تنظیم و تسطیر کی نوبت آئے۔ ایسے معاملات تو مہینے گزر جاتے ہیں۔

ادھر مولانا کو افکارِ سفر مدینہ منورہ اور اس کے انتظامات، مختلف طبقات کے ہندوستانی حجاج کی ہر وقت آمد و رفت جن کا ہجوم ہمیشہ مولانا کے پاس لگا رہتا تھا، شوقِ ادائے عبادات در حرم محترم جو کہ مدت ہائے دراز کے بعد نصیب ہوا تھا، کہاں ایسی باتوں کی مہلت لینے دیتے تھے۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ غالب پاشا محمل کے روانہ ہوتے ہی طائف کو لوٹ گیا۔ نہ وہ ترکی زبان کے سوا اردو فارسی وغیرہ جانتا تھا (عربی میں دو چار ضروری الفاظ کے علاوہ گفت و شنید سے بھی واقف نہ تھا) نہ مولانا کو ترکی زبان سے واقفیت۔ مولانا کے لیے وہاں کوئی وسیلہ بھی ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے ایسے بڑے حُکّام کے یہاں تک رسائی ہوتی اور نہ ہی مولانا کو مدت العمر حُکّام اور اہل دنیا سے قلبی میلان تھا۔ پھر باوجود ان امور کے نہ معلوم گورنمنٹ نے کہاں سے اس غالب پاشا کے وثیقہ کے خواب پریشان دیکھے اور ان پر یقین کر لیا۔ اسی طرح گورنمنٹ کو لوگوں نے جو کہ حقیقۃً گورنمنٹ کے دوست نما دشمن ہیں، بہت سے غلط سلط دھوکے دیئے ہیں جن کی غلطی واقعات نے آفتاب کی طرح روشن کر دی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا کو اسلام کی ہمدردی اور دینی محبت بہت زیادہ تھی اور باایں ہمہ اپنے ملک اور قوم کی آزادی کا نہایت زیادہ خیال تھا، اس میں وہ ہمیشہ بیچاں رہا کرتے تھے، طرح طرح کی تدبیریں اور کارروائیاں بھی عمل میں لاتے رہتے تھے۔ مگر گفتگو اس میں ہے کہ مولانا ان مقاصد کے لیے کسی خارجی حکومت سے مدد لینا اور اس سے گورنمنٹ کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوئے کوئی ایسی عملی کارروائی کر رہے تھے یا نہیں؟ دشمنوں نے تو گورنمنٹ کو اسی کا ہوا دکھا کر مولانا سے بدظن بنا دیا تھا۔ گورنمنٹ اندورن ملک آزادی کی کوشش اور قانونی حدود میں ہمدردی اسلام کے اعمال کو، جب کہ وہ امن و سکون سے ہوں، نہیں روکتی اور نہ برا سمجھتی ہے ...... غرضیکہ جو اسباب و وجوہ طلب صادق کی عوام و خواص میں ہونی چاہئیں، ان کے لیے کوشش کرنا گورنمنٹ کے مقصد میں مدد دینا ہے۔ اسی لیے گورنمنٹ کے نزدیک یہ امر نہایت محبوب اور پسندیدہ ہے، وہاں دول خارجیہ کے تعلقات کو البتہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس کی بہت سی افتراء پردازیاں دشمنوں نے کیں، مگر الحمدللہ کوئی بھی پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکی اور نہ ان میں واقعیت کی جھلک تھی۔

لوگوں نے گورنمنٹ کے کانوں تک یہ بھی پہنچایا کہ مولانا نے انور پاشا اور جمال پاشا سے تحریری وثائق اور عہود حاصل کر کے مولوی ہادی حسن صاحب کے ذریعے سے فلاں صندوق میں جس میں فلاں فلاں کپڑے رکھے ہوئے ہیں، بھیجے ہیں۔ اس خبر پر فوراً دوڑا اور گارد مولوی ہادی حسن صاحب کے مکان پر ان کی غیبت میں پہنچی اور مکان کی تلاشی لے کر صندوق کو دیکھا اور پھر ہر ہر تختہ کو توڑا مگر کچھ بھی نہ نکلا اور نکلتا کیسے؟ جب کہ کوئی شئی ہو ہی نہیں تو کہاں سے نکلے؟ مگر دشمنوں نے گورنمنٹ کو دھوکا دینے میں کوئی فروگذاشت نہ کی۔ ایسے اعمال سے غالباً اتنا تو نفع ضرور ہو گا کہ گورنمنٹ کو بھی پتہ چل گیا کہ اکثر باتیں لوگوں کی مولانا کے حق میں خلاف واقعہ ہیں بلکہ شخصی اغراض پر ان کا دارومدار ہے،، (اسیر مالٹا ص ۲۳-۲۷)

آگے چل کر پھر مولانا مرحوم کا جمال پاشا اور انور سے ملنے اور ان سے وثائق حاصل کرنے کو دروغ گوئی، افتراء پردازی اور غلط افواہیں قرار دیا ہے (ص ۴۲-۴۳)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مولانا محمود حسن مرحوم نے غالب پاشا وغیرہ سے کوئی درخواستِ امداد نہیں کی تھی تو پھر مولانا مرحوم کی گرفتاری کیوں عمل میں آئی؟ تو اس کی وجہ مولانا حسین احمد مدنی نے یہ بتلائی ہے کہ ترکوں کے خلاف ایک فتویٰ تکفیر تیار کیا گیا تھا، جس پر شیخ الہند اور ان کے رفقاء سے بھی دستخط کرنے کو کہا گیا، ان کے دستخط سے انکار کرنے پر شریف حسین کو بڑا غصہ آیا اور اس نے ان کو قید کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ (خلاصہ از "اسیر مالٹا")

۲۔ شیخ الہند کے ایک اور سوانح نگار مولانا سید اصغر حسین نے "بدظنی پیدا کرنے کا ایک اور واقعہ" کے عنوان سے اس گرفتاری کی ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ اس کا بھی مبینہ تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ "حیات شیخ الہند"، ص ۷۱، ادارہ اسلامیات۔ لاہور)

خیال رہے یہ کتاب بھی بڑی معتبر و مستند ہے۔ اس کے دیباچے میں کتاب میں بیان کردہ واقعات و تفصیلات کی استنادی حیثیت کی بابت کہا گیا ہے۔

"جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں اکثر چشم دید حالات ہیں یا یہ حضرت اقدس کی زبان مبارک سے سُنے ہوئے واقعات یا بعض بہت ہی معتمد حضرات کی روایات"، (صفحہ ۱)

نیز شیخ الہند کی روحانی پسندیدگی کا اظہار بایں الفاظ کیا گیا ہے۔

"ایام ترتیب و تالیف میں بعنواناتِ مختلفہ سات مرتبہ خواب میں زیارت ہو جانے سے اتنی امید بندھتی ہے کہ ناراض نہیں ہیں"، (صفحہ ۱۱)

اس کتاب میں بھی حضرت شیخ الہند رح اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کی اسی قسم کی وجوہات بیان کی گئی ہیں جو "اسیر مالٹا" میں بیان کی گئی ہیں اور کہیں بھی "تحریک ریشمی رومال" کا ذکر نہیں آیا ہے بلکہ ایک مقام پر لکھتے ہیں

"صلحاء کی یہ جماعت، جس کو اپنی یکسوئی اور شغل فی العبادت اور زہد عن الدنیا۔

اور اظہارِ حق کے سوا اپنا کوئی قصور ہی معلوم نہ تھا، اس (گرفتاری کے) حکم کو سُن کر حیران رہ گئی،، (صفحہ ۷۲)

بہرحال شیخ الہند رحؒ کے یہ دونوں اولین اور مستند سوانح نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ان کی گرفتاری انگریز کے خلاف کسی تحریک کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ غلط افواہوں، افتراء پردازیوں اور حجاز میں پیش آمدہ مذکورہ فتویٰ تکفیر سے انکار اور دیگر مشتبہ امور کا شاخسانہ تھا۔ علاوہ ازیں ان دونوں سوانح حیات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت شیخ الہند اس سفر حجاز کے وقت اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، ۷۰ سال سے اوپر ان کی عمر تھی، اس عمر میں وہ کسی سیاسی تحریک کو برپا کرنے یا اس میں قائدانہ حصہ لینے کے قابل ہی نہیں تھے۔

ان سب پر مستزاد مولانا سید اصغر حسین رح نے ،،سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ سے تعلق،، کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس کا لفظ لفظ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ گرفتاری کے وقت تک حضرت شیخ الہند اور ان کے ہزارہا تلامذہ سیاسی امور و معاملات سے بالکل بے تعلق رہے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں یہ مفصل بیان بھی نقل کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں ،،حضرت مولانا حقیقی طور پر ایک تارک الدنیا، راغب فی الآخرۃ گوشہ نشین عالم تھے۔ ظاہری درس و تدریس اور تعلیم حدیث اور باطنی ہمت و توجہ اور تعلیم ذکر و فکر سے تمام عمر اصلاحِ خلق میں مصروف رہے۔ اسبابِ شہرت کو نہ کبھی اختیار کیا نہ پسند، اور امورِ سیاسیہ میں نہ کبھی دخل دیا نہ بلا ضرورت اس درجے کو اپنے منصب عالی کے شایاں سمجھا۔ آپ کی اس یکسوئی کا اثر تھا کہ آپ کے ہزارہا ہم خیال اور زیر اثر مُردوں، معتقدوں، شاگردوں کو بھی اس قسم کے امور سے اجتناب رہا۔ آپ کا جس کسی سے جس قدر بھی تعلق تھا، تھوڑا ہو یا بہت، اور جس شخص سے بھی علاقہ تھا، محبت کا ہو یا بُغض کا، وہ سب اسلام اور شریعت کے تابع اور ثمراتِ ایمانی میں داخل تھا۔

غیر مسلم حکومت اور غیر اسلامی سلطنت خواہ کتنی ہی انصاف پرور اور رعیت گستر

ہو مسلمان کے لیئے اس کے ماتحت رہنا ایک انتہائی کلفت ہے اور دینی مصیبت
...... مگر باین ہمہ حضرت مولانا رضینا بقضاء اللہ کہہ کر نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ
ہندوستان میں بسر کرتے رہے۔ دل میں خواہ کتنی ہی کلفت و کراہت ہو مگر زمانہ شاہد
ہے کہ کبھی تحریراً یا تقریراً کوئی اظہار و اعلان اس قسم کا نہیں کیا جس کو حکومت بہ نظر
اشتباہ دیکھ سکے...... حضرت مولانا رشید احمد (گنگوہی) قدس سرہ کے نام سے
ایک زمانے میں بہ ضرورت شرعی جو فتاوی عدم اذ غدر با معاہدین اور حرمت قتل
معاہدین کے شائع ہوئے، وہ حضرت مولانا کے تصدیق فرمودہ اور دستخط سے
مزین تھے......

گورنمنٹ کی کوئی غلطی ہو یا فروگزاشت اور عمداً ارتکاب کیا گیا ہو یا اتفاقیہ کوئی
واقعہ پیش آگیا ہو، جس معاملے میں اہل اسلام کی توہین اور تکلیف کا شائبہ بھی ہوتا تھا،
حضرت مولانا کو بمقتضائے قوت ایمانی اس سے نہایت صدمہ پہنچتا تھا اور عمال و حکام
سے ایک ناگواری کی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن اس قسم کے تمام امور میں حضرت مولانا
نے قلبی احساس اور باطنی صدمات سے آگے قدم نہیں بڑھایا۔ اور ہمیشہ فان لم
یستطع فبقلبہ کی رخصت پر عمل فرماتے رہے۔ چنانچہ کانپور کی مسجد کا المناک اور
رنج افزا واقعہ پیش آیا تو حضرت مولانا کو نہایت شدید احساس ہوا اور ان ایام میں مخصوص
طور سے کئی روز تک زبان سے حسرت اور چہرے سے ملال کا اظہار ہوتا رہا اور
باوجودیکہ بعض مشاہیر وقت نے مفید سمجھ کر حسب استطاعت تحریر و تقریر وغیرہ سے
کچھ عملی حصہ بھی لیا لیکن حضرت مولانا نے اس فرض کفایہ میں ان حضرات کی ہمت کو
کافی سمجھا یا عدم استطاعت کی وجہ سے کسی عملی سعی کو بے سود۔ بہرحال خاموش رہے۔
۱۳۳۲ھ میں یورپ کی تباہی و بربادی بخش جنگ عظیم شروع ہوئی اور جرمنی
اور برطانیہ کی آویزش سے بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ آٹھ کروڑ مسلمانان
ہند کے جذبات و احساسات کے خلاف برطانیہ نے ایک ایسی سلطنت کی مراعات
و مودت کی وجہ سے جو گذشتہ زمانے میں برطانیہ کا مد مقابل بلکہ ہیبت ناک دشمن

شمار ہوتی تھی، اس لیے قابلِ رحم ترکی سلطنت کی امداد و اعانت کے طریق بھی ہندوستان کی طرف سے مسدود ہو گئے اور مسلمان اپنا زخمی جگر تھام کر رہ گئے۔ اس پُر آشوب اور سخت صبر آزما زمانے میں گورنمنٹ کے دلِ خوش کن وعدہ ہائے حفاظت مقاماتِ مقدسہ اور حمایتِ اقتدار خلافت کے اعتماد پر اہل علم اور مقتدر حضرات نے اور اہل ہندوستان کے مقتدر لیڈروں نے جس صبر و استقلال اور خاموشی سے کام لیا اور عوام میں جس قسم کا سکون رہا، وہ اس وقت عدم استطاعت کے سہل الوصول عذر پر اگرچہ جائز تھا لیکن آئندہ زمانے میں بہ نظر کراہت نہیں دیکھا جائے گا تو بہ نظر تعجب ضرور۔

حضرت مولانا اس وقت تک ہندوستان میں تشریف رکھتے تھے مگر بالکل خاموش، قلبی صدمات اور رُوحانی کلفتوں کا اضافہ ہوتا جاتا تھا اور گرانی اور ناگواری بڑھتی جاتی تھی لیکن سب برداشت کرتے رہتے تھے اور سیاسی امور میں قولاً و عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تھے۔ گویا پالٹکس کے لیے دوسروں کو اہل سمجھ کر خود اس میں دخل نہیں دیتے تھے کیونکہ (جیسا سابقاً معروض ہوا ہے) آپ کے تمام تعلقات حُب و بُغض تابع شریعت تھے اور شرعاً بھی آپ سکوت کی گنجائش سمجھتے تھے۔ یہاں کی کُلفتوں نے حرمین کی خاک بوسی کے شوق کو دوبالا کر دیا اور آپ نے ارادۂ سفر فرما دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان ایام میں قلبی ناگواری بہت بڑھ گئی تھی اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ آپ کی روانگی سے چھ ماہ قبل جب سر جیمس لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ دار العلوم میں رونق افروز ہوئے تو حضرت مولانا نہ شریکِ جلسہ ہوئے اور اپنے مکان پر رہے۔ (حیات شیخ الہند، ص ۲۱۹-۲۲۳)

اس کے بعد سوانح نگار نے لکھا ہے کہ حرمین شریفین میں شریف کی بغاوت اور گورنمنٹ برطانیہ کی اس کی اعانت اور اپنی مطلوبانہ نظر بندی اور اسیری کے زمانے میں انگریزوں کے ترکی خلافت اور اس کے ایمان کے خلاف طرزِ عمل کو دیکھ

کہ حضرت مولانا کے تکدرِ خاطر میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

"اور اب حضرت مولانا اس مطیع و خائف شہری رعایا کے افراد میں نہ رہے جو مشتبہ و ناگوارِ سرکار امور کو بھی محرماتِ ابدیہ کا مساوی سمجھے"۔

چنانچہ رہائی کے بعد۔

"آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور سکوت و صموت کی گنجائش نہ رہی۔ احکام شرع کی اطاعت، مولانا کی اسلامی حمیت اور دینی غیرت نے بیٹھنے نہ دیا"۔

(ص ۲۲۴)

یعنی وہی بات جو ہم لکھتے آ رہے ہیں کہ مولانا محمود حسن اور دیگر علماء دیوبند مالٹا کی اسیری کے بعد انگریز کے خلاف تحریکات میں شامل ہوئے ہیں، "حیات شیخ الہند" کے مصنف نے بھی لکھی ہے۔ اور اس کے بعد مولانا محمود حسن مرحوم کی ان سرگرمیوں کی مختصر تفصیل بیان کی ہے جو ہندوستان واپسی کے بعد ان سے ظہور میں آئیں۔ اس سے چونکہ ہمیں بھی انکار نہیں، اس لیے اسے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال شیخ الہندؒ کے دونوں سوانح نگاروں کے بیانات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ جس "تحریک ریشمی رومال" کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نہ مولانا مرحوم کے سفر حجاز کا وہ مقصد تھا جو باور کرایا جاتا ہے، اور نہ ان کی گرفتاری انگریز کے خلاف کسی تحریک کا نتیجہ تھی۔ بلکہ شیخ الہند اور ان کے ہزارہا تلامذہ اور عقیدت مند گرفتاری تک سیاسی تحریکات سے بالکل تھلگ رہے ہیں۔ گویا ع منفعل گردید رائے بو علی با رائے من

اس کے بعد ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ "نقش حیات" میں اس "تحریک ریشمی رومال" اور علمائے دیوبند کے سیاسی کردار کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ تاریخ نگاری ہے یا تاریخ سازی۔ حقیقت ہے یا افسانہ آرائی؟ واقعات ہیں یا زور تخیل کی کرشمہ آرائی؟ اس آئینے میں ہر انصاف پسند نگاہ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ ع ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

دیوبندی احناف کی تاریخ سازی کی ایک اور واضح مثال اور شہادت

دیوبندی علماء اور اہلِ قلم نے پروپیگنڈے کے زور سے جو تاریخ سازی کا کام کیا ہے، اس کا اعتراف بعض ایسے دیوبندی اہلِ علم و اہلِ قلم نے بھی کیا ہے۔ جو واقف حال، خلوتی راز اور گھر کے بھیدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے مولانا عامر عثمانی مدیر "تجلی" دیوبند ہیں۔ عامر عثمانی مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے قریبی عزیزوں میں سے ہیں اور اس عثمانی خاندان اور اس کے اکابر کا جو حصہ دارالعلوم دیوبند اور اس کی علمی و انتظامی خدمات و ترقی میں ہے، وہ محتاجِ وضاحت نہیں۔ لیکن دارالعلوم دیوبند پر قابض قاسمی خاندان نے عثمانی خاندان کے اکابر کی تمام خدمات کو نظر انداز کر کے دارالعلوم دیوبند کی ترقی کا سارا کریڈٹ قاسمی خاندان کو عطا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس تاریخ سازی پر عثمانی خاندان کے ایک باخبر فرد مولانا عامر عثمانی مرحوم نے حسبِ ذیل الفاظ میں ماتم کیا ہے۔

"دارالعلوم کے سلسلے میں عاجز کے بزرگ اقرباء کا تذکرہ آپ نے جس انداز میں کیا ہے اس پر چند الفاظ کہنے کو بے اختیار طبیعت چاہتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے، کہ دارالعلوم کی تاریخ اب وہ نہیں ہے، جو آپ سمجھے بیٹھے ہیں۔ بلکہ وہ ہے جیسے "سوانح قاسمی" میں باور کرایا گیا ہے۔ تاریخ نویسی کا فن پرانا ہوا، اب تاریخ سازی کا دور ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی پر اللہ کی رحمتیں ہوں، کچھ تو کرشمے ان کی پردازِ خیال نے دکھلائے کچھ حکمت ان بزرگوں نے دکھلائی، جن کے نزدیک دارالعلوم کے قیام و ترقی کا کریڈٹ ایک خاص خاندان کو دینا دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ ابھی

جولائی ۱۹۶۰ء میں خاکسار کراچی تھا۔ یہاں سید محی الدین صاحب سے جو کبھی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے، جن کی نیک نفسی اور زہد و تقویٰ پر ان کے واقف کاروں میں کوئی اختلاف نہیں اور جن کے گہرے تعلقات مولانا مناظر احسن گیلانی سے بھی تھے، ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک موقع پر انہوں نے واقعہ سُنایا کہ جب "سوانح قاسمی" چھپنے کی تیاریاں تھیں تو ہمیں اس کو پڑھنے کا بے حد اشتیاق لگا ہوا تھا۔ چھپ کر آ گئی تو ذوق و شوق سے پڑھا۔ لیکن بڑی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ جن تاریخی امور کا ہمیں علم تھا ان کا تو اس میں دور دور پتہ نہیں، مگر ایک نئی تاریخ ضرور موجود ہے۔

اضطراب ضبط نہ ہوا تو سفر کر کے گیلانی صاحب کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت یہ آپ نے کیا کیا لکھ دیا؟ گیلانی صاحب کے چہرے پر کرب کی علامات ظاہر ہوئیں اور تاسف کے ساتھ فرمانے لگے۔

کیا بتاؤں بھائی! کمال ہو گیا، جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ تو کچھ اور ہی تھا۔ ہم نے پوچھا، اس کا کیا مطلب ہوا؟ انہوں نے فرمایا میرے تقریباً پانچ سو صفحات بدل دیئے گئے ہیں۔ (خیال رہے "سوانح قاسمی" بڑے سائز کے ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل تین حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ ناقل)

اس حقیقت کو اور بھی متعدد حضرات جانتے ہیں۔ اور وہ ابھی زندہ ہیں۔ کہ دارالعلوم کی طرف سے چھاپی ہوئی دارالعلوم کی مستند تاریخ "سوانح قاسمی" کس بے تکلفی کے ساتھ اصل مسودے میں تغیرات کر کے چھاپی گئی ہے۔ اور یہ تغیرات معمولی نہیں بلکہ وسیع تر اور بنیادی ہیں۔"

(ماہنامہ "تجلی" دیوبند۔ صفحہ ۵۷، فروری و مارچ ۱۹۶۱ء)

۶ مخلصانہ گذارش

آخر میں راقم دیوبندی اہل قلم اور تاریخ نویسوں سے مخلصانہ عرض گذار ہے کہ مرحومین علمائے دیوبند کا دینی و علمی مقام مُسلّم ہے اور ان کی عظمت کے لیے ہی بہت کافی ہے، کچھ ضروری نہیں ہے کہ کھینچا تانی کر کے انہیں ریاست کا بھی

مردِ میدان اور جہاد و غا کا بھی شہسوار ثابت کیا جائے حتّٰی کہ اس میں اتنا غلو کیا جائے کہ جماعت مجاہدین (اہلحدیث) کو تو انگریزوں کا وفادار باور کرایا جائے اور اُن علمائے دیوبند کو جو کم ازکم ۱۹۱۷ء تک، جبکہ انگریزوں کا اقتدار پورے عروج پر تھا اور اس کے اقتدار کو للکارنے والے صرف وہ مجاہدین تھے۔ جن کی اکثریت عامل بالحدیث تھی، سیاسی ہنگاموں سے بھی الگ تھلگ رہے اور تحریکِ جہاد سے بھی بالکلیہ مجتنب۔ انہیں انگریز کے اقتدار کا واحد حریف باور کرایا جائے۔

خدا شاہد ہے، ہمارے لیے یہ بحث قطعاً خوش گوار نہیں، ہمیں پورا اندازہ ہے کہ ہمارے جوابی اور دفاعی مضمون سے دیوبندی حلقوں کی جبینیں شکن آلود ہو جائیں گی لیکن یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ محض "سیاست" ہی معیارِ فضیلت وعظمت نہیں ہمیں اس قضیۂ نامرضیہ میں حصہ لینا پڑا۔ اگر ہمارے دیوبندی کرم فرما اس موضوع کو مشقِ ناز نہ بناتے اور جماعت اہلحدیث پر ناحق تہمتیں نہ تراشتے تو ہم علمائے دیوبند کی سیاسی وجہادی خدمات پر کبھی قلم نہ اُٹھاتے، کیونکہ ہمارے نزدیک صرف یہ (سیاست)، ہی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے ہی ہر شخص کی خدمات کا طول وعرض ناپا جائے۔ ملی وقومی خدمات کے مختلف دوائر ہیں۔ اور جس نے جس دائرے میں بھی ملی وقومی خدمات سرانجام دی ہیں وہ مسلمان قوم کا محسن ہے۔ جس پر اس کی قدر وعظمت کا اعتراف ضروری ہے، لیکن کوئی شعبہ اگر کسی کی ہمہ جہتی خدمات کے باوجود، اس کی سرگرمیوں سے باہر رہ گیا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اُسے اُس شعبے کا بھی مردِ میدان ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے، بلکہ یہ ظلم کیا جائے۔ کہ دوسروں کی خدمات کا انکار کر کے اُن کا سہرا بھی اپنے ممدوح کے سر باندھنے کی ناکام سعی کی جائے، ہماری یہ تحریر دراصل اسی زور زبردستی اور ظلم کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ
پر
بعض افتراءات والزامات کا جائزہ

ذیل کا مضمون "بادبان" لاہور میں شائع شدہ ایک انٹرویو کے جواب میں ہے۔ جس میں حضرت شاہ شہیدؒ پر بے سروپا الزامات عائد کیے گئے تھے۔ یہ مضمون "بادبان" اور "الاعتصام" میں شائع ہو چکا ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اب اسے کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ (ص۔ی)

گذشتہ دنوں ایک دوست نے "بادبان" کا ایک شمارہ عطا فرمایا جس میں عبدالستار نیازی صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہُوا ہے۔ جس میں موصوف نے دینی جماعتوں کے اتحاد کے لیے ایک چار نقاطی فارمولا پیش کیا ہے۔ اس میں ان کا روئے سخن اپنے ہی ہم مذہب (حنفی دیوبندی برادران) کی طرف ہے۔ اس لیے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس انٹرویو کے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا تعلق موصوف کی غلط بیانی بلکہ بہتان تراشی اور افترا پردازی سے ہے۔

اس انٹرویو میں تحریکِ مجاہدین کے سپہ سالارِ اعلیٰ، اس کے روحِ رواں اور اس کے سرخیل شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے خلاف بُری دیدہ دہنی کی گئی ہے۔ انٹرویو کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

" شاہ ولی اللہ کے خاندان نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا لیکن اسی

خاندان کے ایک فرد اسمٰعیل نے نجدی دین اختیار کر لیا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر حملے کیے جس پر ۱۲۴۸ھ میں ایک مناظرہ ہوا۔ جس میں علمائے اہلِ سنت نے ان کا مقابلہ کیا۔ بعد ازاں اسی اسمٰعیل نے انگریز کی حمایت شروع کر دی۔ یہی وہ دور تھا جب اسمٰعیل اور علمائے دیوبند نے جہاد کے خلاف فتویٰ دیا ..... (انگریز) نے انہی دونوں دینی طبقوں کو استعمال کیا۔"

یہ بحث بھی اس وقت چھوڑ دیجیے کہ بحث ہو دینی جماعتوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی، لیکن داعی اتحاد دوسرے فریق کے اکابر کے خلاف نہ صرف اس طرح گستاخانہ زبان استعمال کرے، بلکہ صریح کذب و افترا کا بھی مظاہرہ کرے، کیا ایسے شخص کو دعوتِ اتحاد میں مخلص سمجھا جا سکتا ہے؟ اور اس کے بیان کردہ نقاط اتحاد کی کوئی اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ جبکہ فریقین کے اتحاد کے لیے شرطِ اول ہی یہ ہے کہ دل آزار گفتگو سے احتراز کیا جائے، کذب و افتراء سے بچا جائے اور ایک دوسرے کے اکابر کا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ تعجب ہے اس اتحاد کے داعی کو اتحاد کی اس ابجد کا بھی علم نہیں؟

بہر حال اتحاد کے اس داعی نے حسبِ ذیل افتراءات سے کام لیا ہے۔

۱۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے نجدی دین اختیار کر لیا۔

۲۔ اس نے نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس پر حملے کیے۔

۳۔ اس پر مناظرہ ہوا۔

۴۔ مناظرے کے بعد اس نے انگریز کی حمایت شروع کر دی۔

۵۔ اسی دور میں علمائے دیوبند نے بھی انگریز کی حمایت کی۔

۶۔ انگریز نے ان دونوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔

سب سے پہلے نیازی صاحب سے یہ پوچھنا چاہیے کہ "نجدی دین" کی حقیقت اور اس کا حدودِ اربعہ کیا ہے؟ اگر موصوف کا مطلب اس سے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی دعوتِ اصلاح و تجدیدِ دین اور اس سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تاثر پذیری ہے — تو اولاً

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا اس دعوت سے متاثر ہونا کوئی جرم نہیں۔ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت خالص قرآن و حدیث کی دعوت سے بالکل مختلف نہیں۔ محمد بن عبدالوہاب نے غیر شرعی رسومات، بدعات، قبر پرستی اور دیگر اسی قسم کے غیر اسلامی عقائد و اعمال کے خلاف جہاد کیا اور امت مسلمہ کو اس خالص دین کی طرف لوٹنے کی دعوت دی جو عہدِ رسالت و عہدِ صحابہؓ میں تھا۔

ثانیاً تاریخی طور پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا نجدی دعوت سے متاثر ہونے کا واضح ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ ایک تو دونوں کی معاصرت ثابت نہیں۔ محمدؒ بن عبدالوہاب کا زمانہ ۱۱۱۵ھ تا ۱۲۰۶ھ ہے، جب کہ حضرت شاہ شہیدؒ کا زمانہ ۱۱۹۳ھ تا ۱۲۴۶ھ ہے۔ گویا شیخ الاسلام محمدؒ بن عبدالوہاب کی وفات کے وقت شاہ شہیدؒ کی عمر نو سال بنتی ہے۔ اسے معروف معنوں میں معاصرت کا اور استفادے کا دور نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے اس وقت رسل و رسائل کے یہ ذرائع بھی نہیں تھے۔ جو اس وقت عام ہیں۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نجدی تحریک کے لٹریچر سے شاہ اسمٰعیلؒ متاثر ہوئے ہوں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ امام محمدؒ بن عبدالوہاب کی دعوت اصلاح کی بنیاد جس طرح صرف قرآن و حدیث پر تھی۔ حضرت شاہ شہیدؒ کی دعوت کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں تھیں۔ اس لیے دونوں کی بنیادی دعوت اور فکر میں یکسانیت، بالکل فطری اور واضح ہے۔ اور قرآن و حدیث سے جو لوگ بے خبر ہیں، ان کو یہیں سے مغالطہ لگتا ہے۔ ہم اس موقع پر مزید اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ایک صاحبِ علم و خبر بزرگ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں، جو اسی قسم کے مغالطے کے ازالے کے ضمن میں انہوں نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"نجدی تحریک یا شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی دعوتِ توحید کا محور صرف وہ دو مقدس چیزیں ہیں، جنہیں ہم کتاب و سنت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام، حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) کے معاصر ہیں اور دونوں کی تعلیم کا ... ایک ہی ہے ... دونوں وقت

کے ناگفتہ بہ حالات سے متاثر ہوئے ...... اور ملتی جلتی راہ اختیار کی یعنی دونوں نے دینِ مُبین کو بدعتوں اور توہمات کی آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کی، کتاب و سنت کے چشمۂ صافی کی طرف دعوت دینے میں بھی دونوں شریک و سہیم ہیں، تقلیدِ جامد کے بندھنوں کے توڑنے میں دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصول میں ہندوستان اور نجد کی تحریکیں ایک ہیں۔ اور اسی یکسانی کی بنا پر اپنوں اور غیروں دونوں کو غلط فہمیاں ہوئیں اور سید صاحبؒ کی تحریکِ تجدید و جہاد کا ڈانڈا نجد کی دعوتِ توحید سے ملا دیا گیا۔ یہ تصنیف یہاں تک بڑھی کہ حج کے موقع پر سید صاحب کے نجدی داعیوں سے ملنے اور متاثر ہونے کا افسانہ زبان زد ہوگیا۔ حالانکہ یہ سب مغربی مؤرخوں کی اُپج کے سوا اور کچھ نہیں۔ نجد و ہند کی تجدیدی تحریکیں اپنی اپنی جگہ بڑھیں اور پھلیں پھولیں، ہندوستان کی دعوتِ توحید یعنی سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی دعوت شیخ الاسلام کی دعوت سے بالکل متاثر نہیں۔ (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو الحركة الوهابية الهندية السياسية۔ الضیاء جلد ۴ شمارہ ۸ "وہابیت۔ ایک دینی و سیاسی تحریک" الہلال پٹنہ، اپریل مئی، جون ۱۹۳۷ء اور سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۲۷۔۲۴۳) لیکن اس اصولی اتحاد اور ظاہری مماثلت کے باوجود دونوں تحریکوں میں کچھ اختلاف بھی ہے اور یہ مقامی حالات اور مزاج کے تنوع کے لحاظ سے ناگزیر تھا۔"

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں۔

"یہ صحیح ہے کہ نجد و ہند کی تحریکیں ایک نہیں۔ لیکن چند فروعی اختلافات کی بنا پر ہم دونوں کو ایک دوسرے کا مناقض بھی نہیں سمجھتے۔ جب توحید کی دعوت دونوں تحریکوں میں موجود ہے اور کتاب و سنت کی پیروی پر دونوں کا اصرار ہے۔ تو پھر فروعی اختلافات کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے؟ ہمارے نزدیک امام محمد بن اسمٰعیل الامیر صنعانی (۱۰۹۹ھ - ۱۱۸۲ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) اور شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) تینوں بارھویں صدی ہجری میں

اسوۂ محمدی کے سچے نمونے تھے اور اس وقت کی تیرہ و تاریک فضا میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتے تھے، آپ چاہیں تو انہیں مجدد بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے ماحول میں دین کی تجدید کی، سُنّتِ محمدی کے صاف اور شفاف چشمے کو شرک و بدعت کی الائشوں سے پاک کیا اور یہ ان ہی نفوس قدسیہ کے دم قدم کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کتاب و سنت کا نام لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور اس پر عمل کرنا اپنا شعار بتاتے ہیں۔ انہی بزرگوں کی صف میں ان کے خوشہ چین قاضی محمد بن علی شوکانی (۱۱۷۳ھ - ۱۲۵۰ھ) حضرت سید احمد بریلوی (۱۲۰۱ھ - ۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ (۱۱۹۳ھ - ۱۲۴۶ھ) بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان تمام مصلحینِ اُمت کی جدوجہد کا مرکز ایک تھا۔ سب کے سب شمع رسالت کے پروانے تھے۔ اور کتاب و سنت کے شیدائی۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کا رنگ غالب تھا۔ کہیں ہندوستانی تصوف کے اثرات باقی رہ گئے تھے۔ اور کہیں طریقہ محمدیہ کی تلقین ہو رہی تھی، کہیں پر شوق شہادت کا غلبہ تھا، کوئی تقلید جامد کے حق میں شمشیرِ بُرّاں کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور کسی کی معتدل مزاجی فقہ سے لے کر تصوف تک تطبیق کو پسند کرتی تھی۔ پس یہ رجحانات کا فرق ہے۔ اصولی اختلاف نہیں اور مزاج و مشرب کے اتنے معمولی فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا مناقص نہیں کہا جا سکتا۔ اور ایک تحریک (یا دعوت) کے عقیدت مند کے لیے دوسرے کے ساتھ وابستگی حرام نہیں قرار دی جا سکتی۔ ایک ولی اللّٰہی، شوکانی اور ان شاگردوں سے استفادہ کر سکتا ہے اور نجدی، ولی اللّٰہیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر سکتا ہے اور یمنی، لیلائے علم کی تلاش میں بادیہ نجد کی ٹھوکریں کھانا گوارا کر سکتا ہے اور علم و عمل کے اس "لین دین"، میں فائدے کے سوا نقصان کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ہندی نژاد کے لیے یمنی یا نجدی اہلِ علم کی شاگردی اس قدر ملعون و مذموم کیوں قرار دی جا رہی ہے؟ کیا اسلام اسی تنگ نظری اور جغرافی حدبندی کی تعلیم دیتا ہے۔"

("مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" ص ۱۰۲-۱۰۹ - طبع پٹنہ)

بہر حال مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی بابت یہ تاثر کہ ان کے افکار و خیالات نجدی تحریک

سے متاثر تھے، تاریخی طور پر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ تاہم یہ امر واقعہ ناقابلِ انکار ہے، کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریکِ جہاد اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوتِ توحید اور تحریکِ تجدید واصلاح دونوں کا مرکز ومحور قرآن وحدیث ہے۔ دونوں تحریکوں سے لوگ توحید کی حقیقت سے آشنا ہوئے، شرک وبدعت سے تائب ہوئے اور قرآن وحدیث سے ان کا رشتہ وتعلق استوار ہوا۔

۲۔ تاریخِ اسلام کی ایک عظیم وجلیل شخصیت کو، جس کی تحریک اور لٹریچر سے لاکھوں انسانوں نے ہدایت کی روشنی پائی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گستاخ قرار دینا تاریخ کا عظیم ترین جھوٹ ہے۔ حضرت شاہ شہیدؒ کی اسی مظلومیت پر مولانا ابوالحسن علی ندوی کا گوہر بار قلم یوں خوں فشاں ہے۔

"مولانا (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کی دوسری فضیلتیں تو رہیں برطرف، ان کی شہادت مُسلّم ہے اور شہدار کی مغفرت مسلم۔ لیکن ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ سے لیکر آج تک کم وبیش ۱۳۰ برس (اب تقریباً ڈیڑھ سو برس) کے طویل عرصے میں شاید ہی کوئی ایسا دن طلوع ہوا ہو، جس کی صبح کو اس شہیدِ اسلام کی تکفیر وتضلیل کا کوئی فتوٰے نہ نکلا ہو، لعنت اور سبّ وشتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو، فقہ وفتاویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کے کفر کے ثبوت میں پیش نہ کی گئی ہو۔ وہ ابوجہل وابولہب سے زیادہ دشمنِ اسلام، خوارج ومرتدین سے زیادہ مارق من الدین وخارج از اسلام، فرعون وہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد وشاگرد بنایا گیا! یہ ان لوگوں نے کہا۔ جن کے جسمِ نازک میں آج تک اللہ کے لیئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا۔ جن کو خون چھوڑ کر کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر؟) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔! یہ ان لوگوں نے

کہا، جن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و عصمت بچانے کے لیے اُس نے سر کٹایا۔ کیا اس کا یہی گناہ تھا اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے۔؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی، سکھ اپنے گھروں میں مسلمان عورتیں ڈال لیتے تھے، مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی اور ان میں گھوڑے باندھے جاتے تھے، اس وقت یہ غیرتِ ایمانی و حمیتِ اسلامی کے مدعی کہاں تھے؟" (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲، ص ۴۵۱-۴۵۲)

حضرت شاہ شہیدؒ کے مخالفین و معاندین اور ان پر گستاخیٔ رسول کا الزام عائد کرنے والوں کا طول و عرض اور حدود اربعہ تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب اس "گستاخِ رسولؐ" (یعنی حضرت شاہ شہیدؒ) کا وہ ہدیہ عقیدت و محبت بھی دیکھ لیجیے جو انہوں نے اپنے اردو اور فارسی نعتیہ قصیدوں میں بارگاہِ رسالت میں پیش کیا ہے۔ حضرت شاہ شہیدؒ اپنی اردو مثنوی "سلکِ نور" میں حمدِ باری تعالیٰ کے بعد فرماتے ہیں۔

خصوصاً جو اکملِ انسان ہے — وہ سارے صحیفوں کا عنوان ہے
وہ انسانِ اکمل ہے سنتے ہو کون — ہوئے مفتخر جس سے یہ دونوں کون
نبی البرایا رسولِ کریمؐ — نبوت کے دربار کا دُرِّ یتیم
حبیبِ خدا سید المرسلینؐ — شفیع الوریٰ ہادیٔ راہِ دین
محمدؐ ہے نام اس کا احمدؐ لقب — بیاں ہو سکے منقبت اسکی کب
دل اس کا جو ہے مخزنِ سرِّ غیب — مُبرّا خطا سے ہے بے شک و ریب
زباں اس کی ہے ترجمانِ قدم — ہوا باغِ دین جس سے رشکِ ارم
بظاہر ہے جو مقطعِ انبیاء — حقیقت میں ہے مطلعِ اصفیاء

اسی طرح ان کا ایک طویل فارسی قصیدہ ہے جو خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہے۔ حضرت شاہ شہیدؒ کا یہ اُردو فارسی کلام ایک مجموعہ میں چھپ چکا ہے جو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (مجموعہ کلام شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، طارق اکیڈمی، فیصل آباد)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں اس طرح ہدیۂ عقیدت وارمغان محبت پیش کرنے والے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا باور کرانا ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ ع

شرم تم کو مگر نہیں آتی

۳۔ ۱۲۴۸ھ میں جس مناظرے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ کیونکر ممکن ہے جبکہ حضرت شہیدؒ ۱۲۴۶ھ میں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ البتہ ان پر یہ ظلم کیا جاتا رہا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ کہ ان کی بعض عبارات سیاق وسباق سے کاٹ کر ان کو غلط مفہوم پہنائے جاتے ہیں۔ جن کی وضاحت علمائے کرام بخوبی کر چکے ہیں۔ مثلاً " اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان"۔ " تحذیر الناس من شر الخناس" (مطبوعہ کلکتہ) " صیانۃ الانسان عن لمۃ الشیطان" (مطبع احمدی ۱۳۰۲ھ) " حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور معاندین اہلِ بدعت کے الزامات" اور دیگر کتابوں میں یہ مباحث دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن میں افترا پردازوں کے دجل وتلبیس کا پردہ اچھی طرح چاک کر دیا گیا ہے۔ ان کے " دلائل" کا تار وپود بکھیر کر رکھ دیا گیا ہے اور اہلِ بدعت کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی گئی ہے۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

۴۔ جہاں تک انگریز کی موافقت کا الزام ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ اتنی عظیم تحریکِ جہاد یہ کس کے خلاف تھی؟ اور انگریز نے اس تحریک سے وابستہ علمائے صادق پور اور دیگر مجاہدین کے ساتھ جو سلوک کیا (جس کی پوری تفصیل کتاب " ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں درج ہے) وہ کیوں کیا؟

کیا کوئی گورنمنٹ اپنے ہی وفادار اور حامیوں کو بھی تہ تیغ کرتی ہے؟ ان کو قید وبند کی صعوبتوں سے گزارتی ہے۔ ان کی جائیدادوں کو تباہ وبرباد کرتی ہے اور ان کو زچ کرنے کے لیے طرح طرح کے مقدموں اور سزاؤں میں پھانستی ہے؟ کیا حکومت کے وفاداروں کا یہی حال ہوتا ہے جو ان مجاہدین کا انگریزی دورِ حکومت میں ہوا؟ پھانسیوں پر انہیں لٹکایا گیا، جزائر انڈیمان بہ عبور دریائے شور میں انہیں محبوس کیا گیا

ان کی جائدادوں پر بلڈوزر پھیر کر انہیں معاشی مار دی گئی، ان پر ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک کے سات سال کے عرصے میں بغاوت اور سازش کے پانچ بڑے مقدمے دائر ہوئے جن میں ہزاروں مجاہدین کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں اور ۱۸۶۳ میں معرکہ امبیلا بپا ہوا جس میں براہ راست انگریزی فوج اور مجاہدین کے درمیان سخت لڑائی ہوئی۔ ان معرکہ آرائیوں، مقدموں اور دیگر دارو گیر اور پکڑ دھکڑ کے اقدامات کے دوران ان مجاہدین پر جو گزری، واقعہ یہ ہے کہ یہ اتنی الم انگیز داستان ہے۔ جس کو پڑھ سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یارائے ضبط نہیں رہتا۔ یہ انہی بلاکشانِ عزم و ہمت کی بے مثال استقامت تھی، جو جذبہ جہاد اور شوقِ اعلائے کلمۃ الحق میں سب کچھ برداشت کیا۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی، ان کے عزائم لپیٹ اور ان کے حوصلے شکست آشنا نہ ہوئے۔ ۵

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تعجب ہے یہ ٹولہ جو آج کل اسلام کے ان عظیم مجاہدین کو انگریز کا وفادار باور کرا رہا ہے، اس دور میں نہ ہوا تاکہ یہ ٹولہ انگریز کو سمجھا سکتا کہ نادانو! جن کو تم نے اپنا دشمن سمجھا ہوا ہے۔ اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہو، یہ تو تمہارے وفادار ہیں تاکہ بے چارے انگریز کے مظالم سے تو بچ جاتے۔

اور یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس وقت انگریزی حکومت نے اپنا ایک خاص آدمی اس تحقیق پر مامور کیا کہ تحریکِ جہاد سے انگریزی حکومت کو کیا خطرہ اور کس حد تک خطرہ ہے؟ اور ہندوستانی رعایا کا عام رجحان کیا ہے؟ اس کی رپورٹ ولیم ہنٹر نے "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کی صورت میں پیش کی۔ اس رپورٹ میں وہ تحریکِ جہاد سے وابستہ وہابیوں کو ہی بار بار حکومت کا باغی اور مخالف کہتا ہے۔ اور باقی تمام طبقوں اور مذاہب کو حکومت کا وفادار۔ لیکن اب سو سال بعد یہ انکشاف ہوا ہے۔ کہ انگریز کے اس خاص نمائندے کی چشم دید رپورٹ بھی غلط ہے اور ولیم ہنٹر نے جن کو انگریزوں

کا واحد دشمن، باغی اور مخالف تبلایا تھا، وہ تو دراصل انگریز کا وفادار تھا۔ آہ سچ ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

۵-۶ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ علمائے دیوبند نے بھی اس دور میں انگریز کی حمایت کی اور انگریز نے ان دونوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ اس الزام کی وضاحت تو علمائے دیوبند خود ہی کریں گے۔ تاہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اس وقت علمائے دیوبند نام کی سرے سے کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی اور اسے ایک مقام حاصل ہونے اور اس کے وابستگان کی کھیپ تیار ہونے میں کچھ مدت لگی۔ جب کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ۱۸۳۱ء میں جام شہادت نوش فرما چکے تھے۔ جب واقعہ یہ ہے تو پتہ نہیں انگریز نے ان دونوں (یعنی علمائے دیوبند اور حضرت شاہ شہیدؒ) کو اپنے مفاد کے لیے کس طرح استعمال کیا؟ الزام عائد کرتے وقت کچھ تو خدا خوفی سے کام لیا جاتا۔ اگر معترض کا اشارہ تحریکِ جہاد کا سکھوں کے تصادم کی طرف ہے کہ اپنے مقصد کے لیے انگریز نے ان کو آپس میں الجھایا اور مجاہدین انگریز کی پالیسی کے مطابق سکھوں سے متصادم ہوئے تو یہ بات بھی تاریخی طور پر بالکل غلط ہے۔ اور جن لوگوں نے حقائق کو مسخ کر کے اور عبارتوں میں قطع و برید کر کے یہی کچھ باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی اصل حقیقت بھی مولانا غلام رسول مہرؒ، مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ نے واضح کر دی ہے۔ اخبار کے صفحات اس بحث کے متحمل نہیں۔ ان ہر دو حضرات نے واضح کر دیا ہے کہ یہ تحریکِ جہاد کفار افرنگ کے خلاف اور خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے تھی۔ اور کوئی دوسرا مقصد اس کے پیشِ نظر نہیں تھا۔

مرزائے قادیان اور انگریزی گورنمنٹ

"الفرقان" ربوہ کی خدمت میں

ذیل کا مضمون موضوعِ کتاب سے اگرچہ قدرے مختلف ہے ۔ تاہم اس کا ایک پہلو اس لحاظ سے مناسبت رکھتا ہے کہ اس میں بھی مولانا بٹالویؒ کے طرزِ عمل کی روشنی میں جماعت اہل حدیث کی اصل پوزیشن کی وضاحت موجود ہے ۔ یہ مضمون ایک مرزائی اخبار کے جواب میں راقم نے ۱۵ سال قبل تحریر کیا تھا جو ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے "الاعتصام" میں شائع ہوا تھا اسے بھی اب مذکورہ وجہ اور دیگر افادی پہلوؤں کے پیشِ نظر کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے ۔ (ص۔ ی)

جب سے جناب شیخ محمد رفیق صاحب گریجہ سول جج جیمس آباد کراچی نے مرزائیوں کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے کہ وہ عقل و نقل کی رُو سے اُمّتِ مسلمہ سے الگ ایک غیر اسلامی فرقہ ہیں اور اس کے بانی جناب مرزا صاحب انگریزوں کے آلۂ کار تھے ۔ اُس وقت سے مرزائی حلقوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے اور وہ مختلف طریقوں سے اس فیصلے کے اثرات کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ان کے بعض اہل قلم نے اپنی جماعت کو اس طرح مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک ابتلاء ہے جس سے اہل اللہ کو دوچار ہونا ہی پڑتا ہے ۔ بعض حضرات نے سرے سے اس شخص کو ہی مرزائی ماننے سے انکار کر دیا ہے جس کو اس مقدمہ میں ایک مرزائی فریق کی حیثیت حاصل ہے ۔ ایک ردِّ عمل کی صورت یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض اُن عدالتوں کے فیصلے گردش میں آ گئے ہیں جنھوں نے عالم بالا کی مصلحتوں کے پیشِ نظر مرزائیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ قرار دیا ہے ۔ مرزائی ان فیصلوں کو پورے

ملک میں پھیلا رہے ہیں، ہمیں بھی وہ پمفلٹ موصول ہوئے ہیں ۔نیز ان کی طرف سے ایک صورت اپنے حلقے کو مطمئن کرنے کی یہ نظر آئی ہے کہ مسلمانوں کی بعض جماعتوں اور بعض افراد کے وہ خیالات پیش کیے جا رہے ہیں جن میں انہوں نے انگریز گورنمنٹ کی "مذہبی رواداری" پر ان کا شکریہ اور ان سے وفاداری کا اظہار کیا ہے ۔چنانچہ "الفرقان" ربوہ کے اگست کے شمارے میں شیعہ، سنی اور اہل حدیث سے متعلق بعض اس قسم کے حوالے پیش کیے گئے۔ اس کے بعد پھر ستمبر کے شمارے میں ایک اہل حدیث عالم کی وہ تحریریں پیش کی گئی ہیں جن میں مذہبی آزادی پر گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا گیا ہے نیز جماعت اہل حدیث کے لیے "وہابی" کے لفظ کے استعمال کی قانونی ممانعت پر اس کے لیے تشکر و امتنان کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے ۔"الفرقان" کے مدیر فرماتے ہیں کہ اگر یہ حضرات انگریز سے وفاداری کے اظہار کے باوجود انگریز کے آلۂ کار نہیں تو مرزا صاحب کو اس قسم کے خیالات کی بنا پر انگریزوں کا آلۂ کار کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ پھر "الفرقان" میں علمائے اہل حدیث کو بالخصوص اس پر "سنجیدگی سے فیصلہ" کی دعوت دی گئی ہے اس لیے ہم اس فرق اور نوعیت کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو انگریزوں سے متعلق مرزا صاحب اور مسلمانوں کے بعض علماء کے طرز عمل میں ہے ۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس فرق پر غور انتہائی ضروری ہے جو مرزا صاحب اور دیگر علماء کے جذبات وفاداری میں پایا جاتا ہے ۔علمائے اسلام میں سے جن حضرات نے انگریز سے وفاداری کا اظہار کیا تو اس کی وجہ خود ان کے بقول یہ بھی کہ اس حکومت کے زیر سایہ مذہبی آزادی پوری طرح حاصل ہے ،نیز یہ کہ مسلمانوں کے پاس وہ قوت و طاقت اور اسباب و وسائل بھی نہیں جن کے ذریعے وہ جنگ کر کے اسے ملک سے نکال دے سکیں ۔اس لیے ایسے حالات میں وہ حکومت وقت سے بغاوت کے جواز کا فتوےٰ صادر نہیں کرتے تھے اور ان حالات میں گورنمنٹ انگریزی سے وفاداری کو انسب سمجھتے تھے تاہم یہ قطعی ہے کہ کسی بھی مسلمان عالم نے جہاد کو سرے سے منسوخ اور حرام قرار نہیں دیا اور نہ ہی آخری زمانے میں آنے والے حضرت مہدی کو خونی مہدی کہا ،جیسے کہ برعکس مرزا صاحب نے نہ

صرف یہ کہ پوری بلند آہنگی سے اس طرح انگریز کی حمایت کا صُور پھونکا جس سے اس شبہے کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ صاحب انگریزوں کے اشارۂ ابرو پر ہی دعوائے نبوت پر "مجبور" ہُوئے بلکہ خود بدولت کو "مہدویت" کے منصب پر فائز کرنے کے لیے مسلمانوں کے عقیدہ "آمد مہدیٔ موعود" کو ختم کرنے کی سعیٔ ناکام کرتے ہُوئے حضرت مہدی کو "خونی مہدی" کا نام دیا"

ہاں تو سنیئے مدیر "الفرقان" صاحب (مختصراً):۔

اولاً خود مرزا صاحب نے اپنے آپ کو انگریز کا "خود کاشتہ پودا" تسلیم کیا ہے (تبلیغ رسالت، ج ۷، ص ۱۹) اور اپنے کو گورنمنٹ کی خیرخواہی اور تائید میں یگانہ بے نظیر و بے مثیل اور انگریز گورنمنٹ کے لیے بطور تعویذ اور پناہ (قلعہ) کے قرار دیا ہے (نور الحق، حصہ اول، ص ۳۳-۳۴) اور خود اپنے اور اپنی جماعت کے لیے سلطنتِ برطانیہ کو اپنی جائے پناہ تسلیم کیا (تریاق القلوب، ص ۲۶)

ثانیاً اپنا مقصدِ بعثت ہی مرزا صاحب نے خلقِ خدا کی اصلاح کی بجائے انگریز کی تائید و اعانت بتلایا ہے

"اس نے مجھے اپنے قدیم وعدے کے موافق..... آسمان سے بھیجا تا میں... ...حضور ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول ہوں، اس (اللہ) نے مجھے بے انتہا برکتوں کے ساتھ چھوا اور اپنا مسیح بنایا تا وہ ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کے پاک اغراض کو خود آسمان سے مدد دے" (ستارہ قیصرہ ص ۱۰)

"اے ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند خدا تجھے اقبال اور خوشی کے ساتھ عمر میں برکت دے تیرا عہدِ حکومت کیا ہی مبارک ہے کہ آسمان سے خدا کا ہاتھ تیرے مقاصد کی تائید کر رہا ہے، تیری ہمدردی رعایہ نیک نیتی کی راہوں کو فرشتے صاف کر رہے ہیں... تیری ہی نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے......" (ستارہ قیصرہ، ص ۱۵)

ثالثاً، گورنمنٹ انگلشیہ کو خدا کی نعمت عظیم الشان رحمت اور آسمانی برکت کہا۔ اور انگریز گورنمنٹ کے شکر کو خدا کا شکر اور اس کے چھوڑنے کو خدا کا چھوڑنا قرار دیا" (شہادت القرآن، ص ۱۲، ۸۶)

رابعاً۔ اپنا مذہب ہی آسمان پر خدا کی اور زمین پر حکومت برطانیہ کی اطاعت اور اس سے سرکشی کو خدا و رسول کی سرکشی قرار دیا (شہادت القرآن، ص ۸۶)

خامساً انگریز گورنمنٹ کی حمایت و وفاداری میں پچاس ہزار کے قریب کتابیں، رسائل اور اشتہار تالیف و طبع کئے۔ انگریز سے متعلق مرزا صاحب کا یہ تحریری ذخیرہ اگر جمع کیا جائے تو اس سے پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں (تریاق القلوب ص ۲۵)

سادساً، سب سے بڑھ کر انگریز کے خلاف جہاد کو نہ صرف انتہائی پرزور الفاظ میں حرام اور منسوخ قرار دیا بلکہ انگریز کے خلاف دل میں جذبۂ بغاوت یا دشمنی رکھنے والوں کو احمق، سخت نادان، سخت جاہل، نافہم مُلّا، دشمن خدا، منکر نبی، شریر، بدذات، حرامی، بدکار، نالائق، ظالم، چور، قزاق اور اسی قسم کے بیہودہ خطابات سے نوازا۔

سابعاً اُس دَور میں جہاں کہیں بھی انگریزوں اور مسلمانوں میں تصادم ہوا۔ امت مرزائیہ نے وہاں اپنے "نبی" کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کی تائید و حمایت کی بجائے انگریزوں کی تائید کی، ان کے لیے فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں، اور مسلمانوں کی شکست اور انگریزوں کی کامیابی پر جشن فتح منایا۔ مثلاً ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اول میں ترکوں کو جو شکست ہوئی اور بعض عرب علاقے ترکیہ کی اسلامی خلافت سے انگریزوں نے الگ کر دیئے اس پر اُمت مرزائیہ کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں ..... کہ گورنمنٹ میری تلوار ہے پھر ہم احمدیوں کو اس فتح (فتح بغداد) پر کیوں خوشی نہ ہو، عراق عرب ہو یا شام، ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں ..... دراصل اس کے محرک خدا تعالیٰ کے وہ فرشتے تھے جن کو گورنمنٹ کی مدد کے لیے خدا نے اتارا تھا"۔ (الفضل ۷ ستمبر ۱۹۱۸ء)

اس سے کچھ عرصے پہلے روس نے اسلامی ترکیہ پر حملہ کر کے اس کے بعض علاقے ہتھیا لیے

تھے، اس پر مرزائیوں کا ردعمل ملاحظہ ہو۔

"تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ روس برابر ترکی علاقے میں گھستے چلے جاتے ہیں.... اللہ تعالیٰ ظالم نہیں اس کا فیصلہ درست اور راست ہے اور ہم اس کے فیصلے پر رضامند ہیں (الفضل ۱۷ نومبر ۱۹۱۴ء)

۲۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں کی مکمل شکست پر قادیان میں زبردست چراغاں کیا گیا اور جشن منایا گیا، اس پر الفضل نے لکھا۔

"یہ پر لطف اور مسرت انگیز نظارہ بہت موثر اور خوشنما تھا اور اس سے احمدیہ پبلک کی اس عقیدت پر خوب روشنی پڑتی ہے جو اُسے گورنمنٹ برطانیہ سے ہے"

(الفضل، ۳ دسمبر ۱۹۱۸ء)

ثالثاً مرزا صاحب نے انگریزوں کی مخبری کا کام بھی کیا اور انہوں نے اپنی جماعت کی مدد سے ایسے "نافہم مسلمانوں" کی ایک فہرست مع نام و پتہ مرتب کر کے گورنمنٹ کو پیش کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے (تبلیغ رسالت، ج ۵، ص ۱۱)

ان وجوہ ہشت گونہ کی بنا پر مرزا صاحب کی حکومت برطانیہ کی تائید و حمایت اور مسلمانوں کے بعض علماء کرام کی وفاداری اور شکریے میں جو زمین آسمان کا فرق ہے اسے بادنیٰ تامل سمجھا جا سکتا ہے۔ دونوں کے طرز عمل کو یکساں باور کرا کے مرزا صاحب کی انگریز پرستی پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ دونوں کے درمیان الفاظ کے دروبست سے لے کر مفہوم و مقصد تک میں جو فرق ہے وہ اتنا عظیم ہے کہ اسے دس بیس حوالے تو کیا اس انداز کے سینکڑوں حوالے بھی ختم نہیں کر سکتے۔

جماعت اہلحدیث پر انگریز کی وفاداری کے الزام کی حقیقت

پھر اشاعۃ السنۃ کے بعض حوالوں کو بنیاد بنا کر خاص طور پر جماعت اہل حدیث پر انگریز کی وفاداری کا الزام تو بہت ہی عجیب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے ایسے خیالات کا اظہار فرمایا ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کیا اہل حدیث صرف
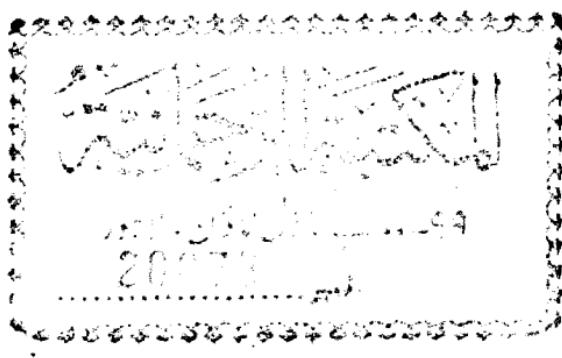
مولانا بٹالوی کی ذات ہے کہ انفرادی طور پر ان کے ایسے خیالات کو پوری جماعت اہلحدیث پر چسپاں کر دیا جائے؟ وہ جماعت کے صرف ایک فرد تھے جو فی الواقع دوسرے بعض علمائے اسلام کی طرح بعض وجوہات (جن کی تفصیل ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہے) کی بنا پر انگریز سے وفاداری کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن کیا اس تاریخی حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ ان کے علاوہ علمائے اہل حدیث کی اکثریت انگریز کے خلاف مصروف جہاد رہی؟ کیا علمائے صادق پور اہل حدیث نہیں تھے جنہوں نے سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد ان کی تحریک جہاد کو پورے عزم و حوصلہ سے آگے بڑھایا؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جس جماعت کے افراد سب سے زیادہ انگریزی مظالم کا شکار بنے وہ اسی جماعت کے افراد تھے۔ صرف ۱۸۶۳ء سے لے کر ۱۸۷۰ء تک کے سات سالہ مختصر سے عرصے میں اس جماعت کے سرکردہ افراد کے خلاف پانچ عظیم مقدمات قائم کئے گئے انبالہ (۱۸۶۴ء) پٹنہ میں دو مرتبہ (۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۰ء) مالدہ (۱۸۷۰ء) راج محل (۱۸۷۰ء)۔ ان مقدمات میں جماعت کے امراء و علماء کو تختہ دار پر کھینچا گیا، اس کے علاوہ کالے پانی اور ضبطیٔ جائیداد کی انہیں سزائیں دی گئیں، جیل کے تاریک زندانوں کو اس جماعت کے دیوانوں نے آباد کیا اور ان مجاہدین کی سرگرمیوں نے انگریز کو بوکھلا کر رکھ دیا جن کو وہابی کہا جاتا تھا، یہ وہابی کون تھے؟ ہنٹر کی کتاب پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی جماعت کے افراد تھے۔ بہرحال چند افراد کے سوا اہل حدیث کی اکثریت از اول تا آخر انگریز سے برسرپیکار رہی ہے۔ اس انداز کی انگریز کی کاسہ لیسی ہم نے اور نہ دوسرے حضرات نے کبھی نہیں کی جو آنجہانی مرزا صاحب کا شعار بلکہ مذہب رہی ہے۔

غور و فکر کا ایک اور زاویہ

پھر اس بحث کا یہ پہلو بھی قابل غور و فکر ہے کہ مرزا صاحب نبوت کے دعوے دار تھے جبکہ مسلمان علماء دعوائے نبوت کو کفر سمجھتے ہیں۔ بعض علماء کی انگریز سے وفاداری اور اس کا شکریہ اور مرزا صاحب کے برٹش گورنمنٹ کی حمایت کو جزوِ ایمان بنانے کے مابین جو عظیم فرق ہے (جس کی ہم نشاندہی

کر آئے ہیں) اس کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ بات سوچنے والی ہے کہ غیر نبی افراد کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں، ان میں مداہنت آسکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ بعض موقعوں پر وہ اس عزیمت و استقامت کا ثبوت پیش نہ کر سکیں جو کفر کے مقابلے میں ضروری ہے۔ اور غیر نبی افراد کے لیے بعض صورتوں میں ایسی رخصتوں پر عمل کی اجازت بھی ہے لیکن انبیاء علیہم السّلام نے کبھی ایسی مداہنت روا نہیں رکھی نہ انہیں اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ کفر کے خلاف وہ ایک برہنہ تلوار اور اس راہ کی صعوبتوں کے لیے وہ کوہِ استقامت و عزیمت ہوتے ہیں، وہ کبھی قوم کو درسِ غلامی نہیں دیتے۔ لیکن مرزا صاحب پتہ نہیں "نبوت" کی کون سی قسم سے سرفراز ہوئے تھے کہ انھوں نے کفر سے مقابلے کی بجائے اس کی اطاعت کو فرض اور جزوِ ایمان قرار دیا، قوم کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانے کی بجائے قوم میں خوئے غلامی کو پختہ تر کیا اور اپنے خدا سے انگریز کافر سے نجات کی دعا کی بجائے اس کی فتح و نصرت اور اس کے بقاء و استحکام کی دعا مانگتے رہے، فیا للعجب۔ کیا انسانی تاریخ میں اس کردار کا کوئی نبی یا مجدد پیش کیا جا سکتا ہے؟ یہی وہ نکتہ ہے جو اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ مرزا صاحب اس اللہ کے فرستادہ نہیں تھے جو کفر سے مقابلہ کا حکم دیتا ہے بلکہ اُس برطانوی ڈپلومیسی کی پیداوار تھے جس کا مقصد مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کرنا تھا۔

بنا بریں مرزائیوں کا اس مقام پر اپنے نبی کو بچانے کے لیے ایسے حوالے پیش کرنا جن میں انگریز سے وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے بالکل بے محل ہے، محض انگریز سے وفاداری اور عدم وفاداری حق و باطل کی علامت نہیں، نہ اس نقطۂ نظر سے کبھی حق و باطل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ حضرات شیعہ بحیثیت مجموعی انگریز کے وفادار رہے ہیں جس کا اظہار خود ہنٹر نے اپنی کتاب میں کیا ہے لیکن ان کے محض اس کردار کو بنیاد بنا کر کبھی ان کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اس بنا پر غلط ہیں۔ البتہ ایک نبی کے حق یا باطل ہونے کے لیے فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کفر کی تائید و حمایت کی یا اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، قوم کو کفر کی غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی یا اسے غلامی کی آہنی زنجیریں بدستور پہنے رہنے پر رضامند کیا۔ اس اعتبار سے بلاشبہ مرزائے قادیان کا کردار مقامِ نبوت تو کجا، اصلاح و تجدید کے مقام سے بھی فروتر ہے

کیونکہ کسی مُصلح و مجدد اور کسی بڑے لیڈر نے بھی قوم کو کبھی درس غلامی نہیں دیا ہے۔ مرزا صاحب بھی ایک عام آدمی ہوتے تو ان کے طرز عمل سے صرفِ نظر کر لینا ممکن تھا لیکن انہوں نے اپنے متعلق نبوت و تجدید کا جو بلند بانگ دعویٰ کیا ہے اور ان کے پیرو کار جس طرح ان کی اس حیثیتِ نبوّت یا مُجدّدیت (معاذ اللہ) کو منوانے پر مُصر ہیں۔ اس کے پیش نظر ان کے اس کردار کو۔ کہ ساری عمر انگریز گورنمنٹ کی حمایت و تائید میں گزار دی۔ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یہ کردار ہی ان کے جھوٹے ہونے کے لیے ایک واضح دلیل ہے۔ افراد سے بڑی بڑی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ جن علماء کی تحریریں "الفرقان" میں شائع کی گئی ہیں، ان سے تعلق رکھنے والی جماعتیں اسے اپنے افراد کی غلطیاں کہہ کر بھی ٹال سکتی ہیں، ان کا یہ اعتراف ان کے مسلک پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا مرزائی حضرات اپنے نبی کے اس کردار کو غلط کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ اور کیا ایسا کرنے کی صورت میں ان کی نبوت کا قصر زمیں بوس نہیں ہو جاتا؟ (الاعتصام ۱۹۷۰ء)

مولانا محمد حسین بٹالوی اور تحریک جہاد

مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کی بابت جو کچھ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے۔ اُس کا تعلق اُس دَور سے ہے جب مولانا مرحوم احناف سے فقہی مسائل میں قلمی معرکہ آرائی میں مصروف تھے۔ غالباً احناف سے ان کا یہ تصادم ہی تحریک جہاد سے ان کی علیحدگی کا باعث بنا اور وہ دوسرے محاذ پر سرگرم ہو گئے۔ ورنہ ابتداءً وہ بھی دیگر علمائے اہلحدیث کی طرح تحریک جہاد میں شریک اور مجاہدین کی سرگرمیوں میں حصّہ دار رہے۔ چنانچہ "ہندوستان میں وہابی تحریک" کے مصنّف پٹنہ کے ایک خفیہ اجتماع کی بابت لکھتے ہیں۔

> "ایک پولیس رپورٹ میں کمشنر پٹنہ کو اطلاع دی گئی کہ ممتاز وہابیوں کا ایک اور جلسہ سراج گنج میں منعقد ہوا۔ جہاں نذیر حسین اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کے بہانے سے گئے ہوئے تھے۔ اس تقریب نے وہابیوں کے اجتماع کے لئے ایک آسان حیلہ مہیّا کر دیا۔ سربرآوردہ حاضرین میں نذیر حسین، محمد حسین لاہوری اور ابراہیم آروی تھے۔ جلسے کے بانی و مہتمم ابراہیم تھے۔ اور مقصد یہ تھا کہ ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اور اس ملک کے دارالحرب ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ سرحد پر وہابی ریاست کا ہندوستان سے رابطہ اور اعانت نسبتاً بہت کمزور پڑ گئی ہے، ہندوستان سے مزید رضاکاروں اور امداد کی ترسیل کی کوششیں کرنا چاہئیں" (ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ نفیس اکیڈمی۔ کراچی)

اس اقتباس سے مولانا بٹالوی" کی تحریک جہاد سے وابستگی واضح ہے۔ تاہم یہ بعد میں ان کے اس موقف میں تبدیلی آگئی۔ جس کی تفصیل اور اس کی نوعیت کی وضاحت ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہے۔ اللہ نے کبھی توفیق دی تو اس پر بھی انشاء اللہ لکھا جائے گا۔ تاہم اس حقیقت میں کچھ شبہ نہیں کہ جماعت اہل حدیث مولانا بٹالوی کے موقف کے برعکس مسلسل تحریک جہاد میں شریک رہی ہے۔ جیسا کہ تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔